زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

اشراق

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہ نامہ

نومبر ۲۰۲۳ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہ نامہ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

جلد ۱ شمارہ ۴ نومبر ۲۰۲۳ء ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس مدیر انتظامی: فرحان سید

مجلس تحریر: ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

معاون مدیر: شاہد محمود

فہرست

شذرات

دین کے طلبہ کے لیے غامدی صاحب کا پیغام — سید منظور الحسن — 3

قصر نماز — محمد حسن الیاس — 8

احمد جاوید صاحب کی دل نواز گفتگو — سید منظور الحسن — 14

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 60-40 (3) — جاوید احمد غامدی — 17

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 21

مقامات

میرے بعد — جاوید احمد غامدی — 22

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (4) — سید منظور الحسن — 25

نقد و نظر

احمد جاوید صاحب کے مذہبی افکار: ایک تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر عرفان شہزاد — 38

نقطۂ نظر

نظم قرآن امت کا حبل المتین — فواد احمد — 43

مختارات

منصب رسالت سے متعلق چار بنیادی غلط فہمیاں — امین احسن اصلاحی — 47

سیر و سوانح

حیاتِ امین (3) — نعیم احمد بلوچ — 53

ادبیات

ندیم — جاوید احمد غامدی — 69

صبحِ درخشاں (بچوں کے لیے)

گالی کا جواب (منظوم حدیث) — سید منظور الحسن — 71

حالات و وقائع

خبر نامہ "المورد امریکہ" — شاہد محمود — 74

افکار غامدی

سید منظور الحسن

دین کے طلبہ کے لیے غامدی صاحب کا پیغام

[جناب جاوید احمد غامدی اکتوبر 2023 میں ملایشیا گئے تو انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم پی ایچ ڈی کے طلبہ نے اُن سے ملاقات کی اور اُن کے فکر کے بارے میں مختلف سوالات کیے۔ نشست کے اختتام پر اُن سے یہ سوال پوچھا گیا کہ وہ دین کے طلبہ کو کیا نصیحت کرنا چاہیں گے؟ اِس کے جواب میں اُنھوں نے جو گفتگو کی، وہ ضروری حک و اضافے کے بعد درجِ ذیل ہے۔ مصنف]

نصیحت کا تو میں خود محتاج ہوں۔ تاہم تین گزارشات ہیں، جو بڑے ادب کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔

1۔ علم کے سچے طالب بن جائیں۔

آپ عامی ہیں یا عالم، معلم ہیں یا متعلم، بزرگ ہیں یا نوجوان، ہر حال میں اپنے آپ کو طالبِ علم سمجھیں۔ جب کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اُس نے بہت پڑھ لیا ہے، کئی علوم و فنون پر دسترس

حاصل کر لی ہے، بڑا عالم و فاضل ہو گیا ہے تو اُس پر علم کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اُس کا یہ استکبار اُسے علم کی جستجو سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ لہٰذا آپ کو کبھی اِس خبط میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ عمر کے آخری لمحے اور زندگی کے آخری سانس تک سچا طالبِ علم بن کر رہنا چاہیے۔

سچا طالبِ علم علم کو اُس کے معیار پر قبول کرتا ہے۔ تعصبات، رغبات، خواہشات کو اُس کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتا۔ اُسے اِس کی پروا نہیں ہوتی کہ کسی بات کو قبول کرنے سے اُس کے مانے ہوئے نظریات بدل گئے ہیں یا اُس کا کہا ہوا رد ہو گیا یا اُس کے علم کی کم زوری واضح ہو گئی ہے۔ وہ اِس پر بھی نظر نہیں رکھتا کہ کہنے والا کون ہے؛ چھوٹا ہے، بڑا ہے، حامی ہے، مخالف ہے۔ وہ ہر کسی کو سنتا ہے اور اُس کی ذات کے بجاے اُس کی بات پر توجہ دیتا ہے۔ اِس معاملے میں وہ کسی انا، کسی تکبر، کسی بڑائی کو دامن گیر ہونے نہیں دیتا۔

سچا طالبِ علم اختلاف کا استقبال کرتا ہے۔ وہ تنقید کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اصل میں موافق بات کو قبول کرنا آسان ہوتا ہے، ہر شخص اُسے خوش دلی سے قبول کرتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ مخالف بات پر آپ نے کیا رویہ ظاہر کیا ہے؟ اُس کو بلا تامل رد کر دیا ہے، اُس سے نظریں چرا لی ہیں یا اُس کا استقبال کیا ہے؟ استقبال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کسی بات کو بے سوچے سمجھے قبول کر لیں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ پوری خوش دلی سے اُس پر غور کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور اِس امید میں کھڑے ہو جائیں کہ ممکن ہے کوئی نئی حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے۔ میرے استاذ مولانا امین احسن اصلاحی جب اپنی تفسیر ”تدبرِ قرآن“ لکھ رہے تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ جس دن میں صبح کو قرآن کھولوں اور کوئی مشکل آیت سامنے آ جائے تو میں کہتا ہوں کہ: ”آج ہوا نہ دن!“ مطلب یہ تھا کہ اب کوئی راز کھلے گا، اب کوئی انکشاف ہو گا، اب کوئی حقیقت واضح ہو گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی معاملہ اختلافی راے کے سامنے آنے پر ہونا چاہیے۔

افسوس کہ ہم مسلمان یہ طرزِ عمل چھوڑ چکے ہیں، یہ احساس کھو بیٹھے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں ہم علم سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہمارے علما، ہمارے عامی، ہمارے مذہبی لوگ، ہمارے غیر مذہبی لوگ، ہمارے اساتذہ، ہمارے طلبہ، سب کا حال یہی ہے۔ یہ صرف مذہبی علم کا معاملہ نہیں ہے، سیاست، معیشت، معاشرت، تاریخ، قانون، ہر علم و فن میں ہم اِسی طرزِ عمل کا شکار ہیں۔ آپ اِن میں سے کسی موضوع پر بھی بات کر لیجیے، اندازہ ہو جائے گا کہ ہم اپنی طے شدہ آرا کے بارے

میں کس قدر متشدد اور بنے بنائے نظریات کے بارے میں کتنے جذباتی ہیں۔

چنانچہ میری آپ کو نصیحت ہے کہ علم کا استقبال کرنے اور اختلاف کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہر دم تیار رہیے۔ میرے سب تلامذہ اِس بات سے واقف ہیں ـــ یہ منظور صاحب یہاں بیٹھے ہیں ـــ جب ہمارے فکر پر کوئی تنقید سامنے آتی ہے تو میرا اِن سے ایک ہی سوال ہوتا ہے، کہ کیا آپ لوگوں نے یہ تنقید پڑھی ہے؟ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی طالبِ علم کے اندر اپنے اوپر ہونے والی تنقید سے بیداری پیدا نہیں ہوئی تو وہ گویا طالبِ علم ہی نہیں رہا۔ جب آپ تنقید کو توجہ سے پڑھیں گے تو دو نتائج میں سے ایک نتیجہ نکلے گا: یا یہ واضح ہو جائے گا کہ آپ ہی کی بات صحیح ہے، اِس سے آپ کو اپنے موقف کی صحت پر اعتماد پیدا ہو گا۔ یا کوئی نئی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اگر کوئی نئی حقیقت سامنے آجائے تو طالبِ علم کے لیے اِس سے بڑھ کر مسرت کی بات اور کیا ہو گی۔ اِسی کی تلاش میں تو طالبِ علم نکلتا ہے۔ اِس پر تو ہمیں ناقد کا شکر گزار ہونا چاہیے، اُس کے ہاتھ چومنے چاہییں کہ اُس نے ہمارے لیے علم کا ایک نیا دریچہ کھولا ہے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں تنقید کے بجاے تنقیص اور مکالمے کے بجاے مناظرے کا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اِس صورتِ حال سے سابقہ پیش آجاتا ہے کہ دوسرا آدمی اچھا لب ولہجہ اختیار نہیں کرتا، وہ آپ کا استخفاف کرتا ہے، آپ کا علم ماپنے کے لیے بیٹھ جاتا ہے۔ ایسی چیزوں سے غض بصر کر لینا چاہیے، اعراض کر لینا چاہیے۔ اِسی کو قرآن نے 'وَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ'[1] کے اسلوب میں بیان فرمایا ہے کہ اہل ایمان فضول اور لاحاصل باتوں سے دور رہنے والے ہوتے ہیں۔

2۔ اپنے اندر حق کی حمیت پیدا کریں۔

حق کی حمیت کا مطلب وہی ہے، جسے ہمارے استاذ مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے خاص اسلوب میں بیان کیا ہے کہ انسان کا سایہ بھی اُس کا ساتھ نہ دے تو پھر بھی وہ حق پر قائم رہے۔ قرآنِ مجید نے اِس کے لیے 'قیام بالقسط' کی تعبیر اختیار کی ہے۔ بتایا ہے کہ حق کی حمیت وحمایت والدین اور اعزہ واقربا کی حمیت سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ حق وانصاف اگر کسی موقع پر

---

[1]۔ ''جو لغویات سے دور رہنے والے ہیں۔'' (المومنون 23:3)

ماں باپ اور عزیز رشتے داروں کے خلاف بھی گواہی کا تقاضا کریں تو اُس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ نسا میں ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ....(135:4)

"ایمان والو، انصاف پر قائم رہو، اللہ کے لیے اُس کی گواہی دیتے ہوئے، اگرچہ یہ گواہی خود تمھاری ذات، تمھارے ماں باپ اور تمھارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے...۔"

یہاں رشتوں ناتوں کے مقابلے میں حق کی حمیت کو واضح کیا ہے اور مائدہ میں قومی حمیت پر حق کی کی حمیت کو ترجیح دی ہے۔ فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ، وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ.(8:5)

"ایمان والو، اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ، انصاف کی گواہی دیتے ہوئے اور کسی قوم کی دشمنی بھی تمھیں اِس پر نہ ابھارے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ انصاف کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، اِس لیے کہ اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔"

اِن دونوں مقامات پر قیام بالقسط کے ساتھ شہادت کی شرط کو بھی لازم کیا ہے۔ یعنی مجرد یہی نہیں کہ خود حق و انصاف پر قائم رہنا ہے، بلکہ اِس سے آگے بڑھ کر اُس کی گواہی بھی دینی ہے۔ یہ گواہی آپ کو اپنے گھر میں دینی ہے، اپنے حلقۂ احباب میں دینی ہے اور اگر ضرورت پیش آجائے تو قومی اور عالمی سطح پر بھی دینی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر آپ کو آپ کے جذبات، آپ کے مفادات، آپ کی خواہشیں حق کی راہ سے ہٹانا چاہیں تو آپ حق پر جم کر کھڑے ہو جائیں۔ حق کو تسلیم کرنے کا موقع ہو تو اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں، اُسے بیان کرنے کی ضرورت ہو تو بے کم و کاست بیان کریں اور اگر وہ گواہی کا مطالبہ کرے تو جان کی بازی لگا کر بھی اُس کا مطالبہ پورا کریں۔ حق اِسی غیرت، اِسی حمیت، اِسی حمایت کا تقاضا کرتا ہے۔

3۔ علم کی زبان کو اختیار کریں۔

عام طور پر ہم جذبات کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ اِس سے ردِ عمل پیدا ہوتا ہے، جو اختلاف کو مخالفت میں بدل دیتا ہے۔ اِس کے بجاے ہمیں علم کی زبان کو اختیار کرنا چاہیے۔ علم کی

زبان تحمل اور بردباری سے عبارت ہے۔ اِس میں مناظرہ نہیں کیا جاتا، مکالمہ کیا جاتا ہے۔ پہلے دوسرے کی بات کو پوری توجہ سے سنا جاتا ہے اور پھر سادہ علمی انداز سے اپنی بات پیش کی جاتی ہے۔ اِس میں انسان نہ گریز و فرار کا راستہ اختیار کرتا ہے، نہ جذبات میں آتا ہے، نہ آگ بگولا ہوتا ہے، نہ آستین چڑھاتا ہے، بلکہ پورے اعتماد اور صبر و تحمل کے ساتھ اپنا استدلال پیش کرتا ہے۔ اگر مخاطب متفق نہ ہو تو اُس پر کوئی فتویٰ صادر نہیں کرتا، بلکہ شائستگی سے ابلاغ کا متبادل اسلوب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کبھی تنقید کرنا پیشِ نظر ہو تو سب سے پہلے وہ دوسرے کا موقف بیان کرتا ہے اور اِس طرح بیان کرتا ہے کہ صاحبِ موقف اگر اُسے سنے یا پڑھے تو پکار اٹھے کہ میں بھی اِس سے بہتر بیان نہیں کر سکتا تھا۔

جب آپ دوسرے کا موقف سمجھنے اور اُسے بالکل درست بیان کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں تو اُس وقت آپ دوسرے کی تنقید سے مستفید ہو سکتے اور اپنی تنقید کو اُس کے لیے مفید بنا سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ دوسرے کے موقف کو سننے پڑھنے سے پہلے ہی اُس کے بارے میں رائے قائم کر لیں، اُس کے نقطۂ نظر کو اُس کی بات سے اخذ کرنے کے بجاے اپنے تصورات سے اخذ کرنے لگیں اور اُس پر تنقید کرنے کے لیے اُس کا موقف اپنے خیالات کی بنا پر ترتیب دینا شروع کر دیں تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے علم اور مکالمے کی زبان کے بجاے تحکم اور مناظرے کی زبان کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اِسی کے نتیجے میں کفر اور انکار کے فتوے صادر ہوتے ہیں، اِسی کے نتیجے میں پراپیگنڈا جنم لیتا ہے، اِسی کے نتیجے میں الزام و دشنام اور جنگ و جدل کا بازار گرم ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ علم کی زبان اختیار کریں گے تو خود بھی علم حاصل کر سکیں گے اور دوسروں تک بھی اُسے پہنچا پائیں گے۔

اِن تین باتوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھیے۔ یہی میری گزارش ہے، یہی میرا پیغام ہے۔

محمد حسن الیاس

قصر نماز

اسلام کی عبادات میں سے نماز اہم ترین عبادت ہے۔ اِس عبادت کے لیے جو اعمال شریعت میں مقرر کیے گئے ہیں، وہ اجماع اور تواتر سے ثابت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے اہتمام سے اِن اعمال کو ادا کیا اور لوگوں کو تلقین فرمائی کہ نماز اِس طرح پڑھو، جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اِس کے اوقات اور اعمال متعین ہیں، البتہ بعض حالات میں اِن میں تخفیف کی اجازت دی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

> ”تم لوگ (اِس جہاد کے لیے) سفر میں نکلو تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں کمی کر لو، اگر اندیشہ ہو کہ منکرین تمھیں ستائیں گے، اِس لیے کہ یہ منکرین تمھارے کھلے دشمن ہیں۔“
>
> (النسا 4: 101)

قرآن مجید نے اِس آیت میں ایک خاص صورت حال کو سامنے رکھ کر نماز میں کمی کی اجازت دی ہے، جسے اصطلاح میں ”قصر“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مسلمان امت نے جس طرح نماز کے اعمال رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے، اُسی طرح قرآن مجید نے جب اِس میں کمی کی اجازت دی تو رکعات میں کمی کے طریقے کو بھی آپ کی سنت سے اخذ کیا ہے۔

قصر نماز کے حوالے سے قرآن مجید کی اِس ہدایت پر غور کیا جائے تو دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

پہلا سوال یہ ہے کہ سورۂ نسا کی یہ آیت ایک مخصوص صورت حال میں نماز کو قصر کرنے کی اجازت کیوں دے رہی ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جنگ کے موقع پر انسان کو لڑائی کے لیے متنبہ رہنا پڑھتا ہے، اِس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُس کا سارا وقت اور توجہات اِسی مقصد کے لیے متعین رہیں۔ اِسی طرح جنگ کے لیے سفر پر نکلتے وقت انسانی نفسیات اقدام، دفاع اور خوف کی کیفیات میں ہوتی ہے۔ یہ کوئی عام حالت نہیں ہوتی، اِس صورت حال میں افراتفری، پریشانی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جس میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ دوسرے کاموں میں زیادہ وقت صرف نہ ہو اور انسان کو سفر کا اصل مقصد پوری طرح مستحضر رہے۔ قرآن مجید کے مطابق چونکہ نماز کی دین میں اِس قدر اہمیت ہے کہ جنگ کے خطرات میں بھی کوئی مسلمان اُسے نظر انداز نہیں کر سکتا، اس لیے اِس صورت حال میں خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے اِس میں کمی کا اعلان کر دیا ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنگ کے سفر میں افراتفری، پریشانی اور آپادھاپی سے جو اندیشہ کی صورت حال پیدا ہوتی ہے، اگر یہی کیفیت بعض دوسرے کاموں سے پیدا ہو جائے تو کیا اِن میں بھی نماز میں کمی کی رخصت دی جانی چاہیے؟ عقل کہتی ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے، اِس لیے کہ رخصت اگر کسی وجہ سے دی گئی ہے تو وہ سبب جہاں پایا جائے گا، رخصت کا متقاضی ہو گا۔ لہٰذا اِسی عقلی اور فطری اصول کو سامنے رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس آیت سے قیاس کیا ہے کہ عام سفروں میں اضطراب، افراتفری اور پریشانی سے اندیشہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، لہٰذا وہاں بھی نماز کو قصر کیا جا سکتا ہے۔

آپ کا اِس رخصت کا مماثل صورت حال پر اطلاق متعدد روایات میں نقل ہوا ہے۔

سیدنا ابن عباس کا بیان ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ، قال: خرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من المدینۃ إلی مکۃ، لا یخاف إلا اللّٰہ رب العالمین فصلی رکعتین رکعتین حتی رجع. (ترمذی، رقم 547)

”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینے سے مکہ کی جانب نکلے، اللہ کے علاوہ کسی کا خوف نہ تھا، تب بھی ہم نے لوٹنے تک دو دو رکعات پڑھیں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی اِس آیت پر قیاس کر کے اِس رخصت میں اندیشے کے دیگر امکانات کو کیوں تسلیم کیا؟ اس کی وجہ سیدنا عمر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود دریافت کی تھی۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ، قَالَ: قُلْتُ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ (لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا) مِنَ الصَّلَاةِ اِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوْا، فَقَدْ أَمِنَ النَّاسُ، فَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: عَجِبْتُ مِمَّا عَجِبْتَ مِنْهُ، فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: ”صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهُ“.
(مسلم، رقم 686)

”یعلی بن امیہ سے روایت ہے کہ میں نے سیدنا عمر کو یہ آیت پڑھ کر سنائی: ”تم لوگ (اِس جہاد کے لیے) سفر میں نکلو تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں کمی کر لو، اگر اندیشہ ہو کہ منکرین تمھیں ستائیں گے“، اِس کے بعد اُن سے کہا: اِس وقت تو لوگ امن کی کیفیت میں آ گئے تھے، تو عمر رضی اللہ نے کہا: جس بات پر تمھیں تعجب ہوا ہے، مجھے بھی ہوا تھا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس حوالے سے پوچھا، اِس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اللہ کی عنایت ہے جو اُس نے تم پر کی ہے، سو اللہ کی اِس عنایت کو قبول کرو۔“

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے ’اِنْ خِفْتُمْ‘ (اگر تمھیں اندیشہ ہو) کی شرط کے ساتھ جو صورت حال بیان کی ہے، اُس کی کوئی مماثل صورت حال کہیں اور پائی جائے گی، جس کے نتیجے میں اضطراب، افراتفری، پریشانی، زحمت یا آپا دھاپی کا کوئی پہلو سامنے آئے تو وہاں بھی رخصت دی جا سکتی ہے۔ مثلاً آپریشن کے دوران میں ڈاکٹر کی نماز قضا ہونے کا اندیشہ ہو یا پھر کہیں آگ بجھانے کی کیفیت ہو اور کارکن نماز پڑھنا چاہیں تو وہاں بھی انسان یقیناً نماز قصر کر سکتا ہے۔

ہمارے عہد کے فاضل محقق سید متین احمد صاحب نے سورۂ نسا کی اِس آیت سے رسالت مآب

صلی اللہ علیہ وسلم کے قیاس کو فکر فراہی میں الفاظ کی حاکمیت کی بحث کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں چونکہ 'الفاظِ قرآن کی حاکمیت' سے صراحتاً عام سفر میں نماز کے قصر کا حکم مستنبط ہوتا نظر نہیں آتا، اس لیے غامدی صاحب بھی مجبور ہوئے ہیں کہ ''روایتوں'' اور ''قیاس'' کی طرف رجوع کریں۔ یہاں وہ اصل سوال لوٹ کر آتا ہے کہ خبرِ واحد کیا دین میں کسی نئے حکم کا اضافہ کر سکتی ہے یا نہیں؟''

فاضل محقق کی خدمت میں عرض ہے کہ عام سفر میں قصر نماز کی رعایت کو ثابت کرنے کے لیے غامدی صاحب نے اپنی تفسیر ''البیان'' اور دین پر اپنی کتاب ''میزان'' میں آیت سے الگ ہو کر روایت کا سہارا نہیں لیا، بلکہ یہ بتایا ہے کہ رسالت مآب کا جو عمل ہم تک نقل ہوا ہے، وہ قرآن مجید کی اِسی آیت سے قیاس پر مبنی ہے۔ اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قیاس ہم تک نقل نہ ہوتا، تب بھی اہل علم اِس آیت کو پڑھ کر قیاس کر سکتے تھے، اِس صورت میں یہ اُن کا اجتہاد ہوتا، بالکل ایسے ہی، جیسے شریعت کی باقی ہدایات میں علما اشتراک علت کے اصول پر احکام کا اطلاق کرتے ہیں۔ اِس پورے عمل کا قطعاً کوئی تعلق الفاظ کی حاکمیت کی بحث سے نہیں ہے۔ فاضل محقق کا سوال اُس وقت قابل اعتنا ہوتا، جب یہ کہا جاتا کہ قیاس کا یہ عمل آیت کے الفاظ میں مذکور سبب سے بے نیاز ہو کر کیا جائے گا۔ فکر فراہی کا تو اصرار ہی یہی ہے کہ قرآن مجید سے جو کچھ بھی اخذ کیا جائے گا، اُس کا واحد راستہ اُس کے الفاظ ہیں۔ الفاظ کلام میں ڈھل کر اگر کوئی علت یا سبب ہم تک منتقل کر رہے ہیں تو ہم اُس کا اطلاق مماثل صورت حال پر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا بتانا یہ چاہیے کہ قرآن مجید کے الفاظ اِس سبب کو بیان نہیں کر رہے جس کا اطلاق کیا جا رہا ہے۔

فاضل محقق اِس کے بعد لکھتے ہیں:

دوسرا سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب نے جو یہ فرمایا کہ:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفروں کے عام سفروں کی پریشانی، افراتفری اور آپادھاپی کو بھی اس پر قیاس فرمایا اور ان میں بالعموم قصر نماز ہی پڑھی ہے۔'' تو کیا اس سے اصولی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قیاس، جیسا کہ اصول فقہ کی تعبیر ہے''، 'مُظہرِ حکم' (حکم کو ظاہر کرنے والا) ہے۔ جب یہ مظہر حکم ہوا (جیسا کہ غامدی صاحب کی تصریح بھی بظاہر لگتا ہے۔) تو فقہ اسلامی کا

مہتم بالشان ذخیرے کا بڑا حصہ جب اسی اصول سے ماخوذ ہے تو اسے محض انسانی فہم قرار دے کر کیوں رد کر دیا جائے۔''

فاضل محقق نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ قرآن مجید کی ہدایات پر قیاس کرنے کی یہ روایت حکم کے مضمرات اور نئے مسائل میں اطلاقات کو جاننے کی کوشش ہے، جس کی بہت شان دار روایت ہماری فقہ میں نظر آتی ہے، اِسے انسانی فہم کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے، اِس پر عرض ہے کہ کیا غامدی صاحب قیاس اور اجتہاد کے اس سارے عمل کو انسانی فہم قرار دے کر رد کرتے ہیں؟ اجتہاد کے موضوع پر غامدی صاحب کے آرٹیکل کے اِس حصہ کو دیکھنا چاہیے، جہاں اِس سوال کا واضح جواب موجود ہے۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''دین کا تنہا ماخذ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ آپ سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے: ایک قرآن، دوسرے سنت۔ آپ کے بعد اب یہ اِنھی دو چیزوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اِن کے علاوہ تبعاً اگر کوئی چیز خدا کے منشا تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ اجتہاد ہے۔ اِس سے ہم بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ اُن احکام کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو براہ راست نصوص میں بیان نہیں ہوئے، لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُنھی کے اطلاقات ہیں جو لوگوں کی رائے اور فہم پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ قیاس اِسی کی ایک قسم ہے۔ قرآن میں اِس کے لیے استنباط کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے جو چیز وجود میں آتی ہے، اُسے فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس کی ابتدا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہادات سے کر دی تھی۔ اخبار آحاد کا ایک بڑا ذخیرہ اِسی کا بیان ہے۔ آپ کے بعد صحابہ و تابعین نے بھی یہ روایت قائم رکھی۔''

(مقامات 156)

غامدی صاحب کا یہ بیان بتا رہا ہے کہ قرآن مجید کی کسی ہدایت کو سامنے رکھ کر قیاس کیا جائے تو یہ روایاتِ آحاد، قیاس اور خارج کو بیچ میں لا کر ''کلامِ الٰہی پر تہمت دھرنا'' نہیں ہے، بلکہ کسی مماثل صورت حال میں خدا کی منشا کو جاننے کا عمل ہے، یہ عمل جس طرح اِس آیت کے الفاظ سے بے نیاز ہو کر نہیں کیا جا سکتا، اُسی طرح کرنے والا، اگر پیغمبر نہیں ہے تو اُس کے اجتہاد سے اختلاف کی گنجایش باقی رہتی ہے۔ یہ صرف پیغمبر ہیں، دین کے معاملے میں جن کے اجتہادات کو

خدا کی تصویب حاصل ہوتی ہے۔ انسان اپنے علم کی حد تک قیاس و استنباط کر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر بحث ہونی ہے تو اِسے انسانی کام سمجھتے ہوئے ہونی ہے۔ اور اگر بحث کرنی ہے تو اِس قیاس کے صحیح یا غلط پر کرنی ہے۔

سید منظور الحسن

احمد جاوید صاحب کی دل نواز گفتگو

جناب احمد جاوید صاحب میرے لیے بمنزلۂ استاد ہیں۔ استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کو جن معاصرین کا غیر معمولی اکرام کرتے ہوئے دیکھا، اُن میں اُنھی کا نام سر فہرست ہے۔ زمانۂ طالبِ علمی میں بارہا تلقین فرمائی کہ اُن کی مجالس میں شریک رہوں اور کسبِ فیض کی کوشش کروں۔ کئی بار ہمت کی، مگر فلسفے کی وجودیاتی صلابت اور تصوف کی ہزار چشمی درمیان میں حائل رہی۔ ہمیشہ یہی خیال غالب رہا کہ:

دلِ گداختہ و چشمِ تر ہی کافی ہے
فتوحِ مملکتِ مہر و ماہ کرنے کو

میرے مضمون پر اُن کی گفتگو سراسر قدر افزائی ہے۔ اُن جیسی عالی مرتبت شخصیت کا ناچیز کی تحریر پر نظر ڈالنا، پھر اُس میں مذکور نقد کو خندہ پیشانی سے گوارا کرنا اور اُس کے بعد پوری دل نوازی سے اُسے موضوعِ سخن بنانا من جملۂ احسان ہے۔ ایسی عالی ظرفی اصحابِ صبر کا خاصا اور نصیب والوں کا حصہ ہے:

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ. (حٰم السجدہ 41:35-33)

”اور (یاد رکھو کہ) یہ دانش اُنھی کو ملتی ہے، جو ثابت قدم رہنے والے ہوں اور یہ حکمت اُنھی کو عطا کی جاتی ہے جن کے بڑے نصیب ہیں۔“

”قرآنِ مجید میں نظم کلام ـــــ ایک تنقید کا جائزہ“ کے زیرِ عنوان میرے مضمون[1] کی نسبت

[1]۔ اشراق امریکہ، اکتوبر 2023۔

سے اُنھوں نے جو گفتگو فرمائی ہے،[2] اُس میں طرزِ تحریر پر بھی کلام کیا ہے اور صاحبِ تحریر کو بھی کلماتِ خیر سے نوازا ہے، مگر نفس مضمون کو موضوع بنانا مناسب نہیں سمجھا۔ گویا التفات و گریز کا وہی طریقہ اختیار کیا ہے، جو غالباً اُنھیں بھی کسی خوش خرام سے پیش آیا تھا:

تھا جانبِ دل صبح دم وہ خوش خرام آیا ہوا
آدھا قدم سوئے گریز اور نیم گام آیا ہوا

لہٰذا موضوعِ زیرِ بحث پر خامہ فرسائی محض اضافی ہو گی۔ دو معروضات، البتہ نگاہِ التفات کی طالب ہیں۔

ایک یہ کہ راقم کے بعض جملوں کو تمسخر اڑانے سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ بات اگرچہ محبت و شفقت کی مہکار لیے ہوئے ہے، مگر گل دستۂ خوں چکاں سے کسی طور کم نہیں ہے۔ جس شخصیت کا غیر معمولی احترام میرے جلیل القدر اساتذہ جناب جاوید احمد غامدی اور جناب ڈاکٹر خورشید رضوی کرتے ہیں، جن کی توقیر ادب، فلسفہ، تصوف اور مذہب کے ہر حلقے میں مسلم ہے، جنھیں میرے رفقا اپنا استاد مانتے ہیں، جن کا عجز مثالی، جن کی انسانی حمیت قابلِ تقلید اور جن کی بندگیِ رب لازوال ہے، اُن کی کسی بات کو ہنسی میں اڑانے کا کوئی تصور بھی کیوں کرے گا؟ پھر مجھ جیسا سادہ منش ایسی جسارت کیسے کر سکتا ہے، جو تصوف کے قادریہ گھرانے میں پروان چڑھا ہے؟ جہاں آداب کا آغاز غلو کی نہایت سے ہوتا ہے۔ خانقاہِ غامدی کی تربیت اُس پر مستزاد ہے۔ جہاں پہلا سبق ہی یہ پڑھایا جاتا ہے کہ: 'ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔' مطلب یہ ہے کہ خاک سار کا عمر بھر یہی چلن رہا ہے کہ:

گھر اور بیاباں میں کوئی فرق نہیں ہے
لازم ہے مگر عشق کے آداب میں رہنا

ایسے لطیف طبع کے لیے تو تمسخر کبائر کا درجہ رکھتا ہے اور پھر وہ کسی صاحبِ منزلت کے باب میں ہو! الامان، الحفیظ۔ میں ایسی انشا پردازی سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

دوسرے یہ کہ عالی جناب کی گفتگو سے یہ تاثر نمایاں ہے کہ وہ کلام کی بے نظمی کو من جملۂ نقائص

---

[2]۔ یہ اُن کے یوٹیوب چینل پر ''واہ بھئی واہ'' کے عنوان سے ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

شمار کرتے ہیں ـــــ جبھی تو اُنھوں نے ''فرد فرد خیالات''، ''پریشان افکار'' اور ''نامربوط تاثرات'' کی تراکیب کو تمسخر پر محمول کیا ہے۔ ـــــ گویا وہ نظم کو کم از کم محاسنِ کلام کے درجے میں ضرور قبول کرتے ہیں۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ اصلاًوہ بھی نظم کی ضرورت کے قائل ہیں۔ تاہم ہمارا معاملہ درجۂ حسن سے کچھ آگے کا ہے۔ ہم اِسے کلام کا جزوِلازم خیال کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ جو کلام ابلاغ مدعا کے لیے وضع کیا جائے، اُس کا منظم ہونا ضروری ہے۔ بے ربطی اور تفریق اگر کسی انسان کے کلام میں در آئے تو اُس کے مدعا کو مختلط کر دیتی ہے، کجا یہ کہ اُسے قرآنِ مجید جیسی کتاب ہدایت سے منسوب کیا جائے۔ اِس وجہ سے ہمارا طالب علمانہ اصرار ہے کہ نظم کلام کی حیثیت طالبانِ فہم قرآن کے لیے چراغِ راہ کی ہے۔ اِس کی دریافت اور اِس کی وضاحت کے لیے مدرسۂ فراہی کے علما کی جدوجہد ایک صدی پر محیط ہے۔ ''تدبرِ قرآن'' اور ''البیان'' کی صورت میں یہ مجسم اور مشہود ہے۔ برس ہا برس کی یہ خالص علمی جدوجہد اتنا حق ضرور رکھتی ہے کہ اہل علم اِس پر سے سرسری گزرنے کے بجاے اِس کے چند اجزا کا بہ غور مطالعہ فرمالیں۔ ممکن ہے کہ یہ اقدام رائج علم کے ٹھہراؤ میں جدت انگیز تلاطم کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ بہر حال یہ:

اک ناصحانہ عرض ہے، دریاؤں پر یہ فرض ہے
دل کی طرح ہر لہر میں تجدیدِ طغیانی کریں
وہ شمع ہے در طاقِ دل، روشن ہیں سب آفاقِ دل
افتادگانِ خاک اٹھو، افلاک گردانی کریں

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(3)

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ ۚ وَ اِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾ وَ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ وَ لَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِهٖ ۪ وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۫ وَّ اِیَّایَ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۴۱﴾ وَ لَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَ تَکۡتُمُوا الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَ تَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۴﴾ وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ وَ اِنَّهَا لَکَبِیۡرَۃٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ ﴿۴۵﴾ۙ الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَ اَنَّهُمۡ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾

(قرآن تمھارے لیے یہی ہدایت لے کر آیا ہے، اِس لیے) اے بنی اسرائیل، میری اُس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی تھی اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو، اور اِس (قرآن) پر ایمان لاؤ جو میں نے اُس چیز کی تصدیق میں اتارا ہے جو تمھارے پاس ہے، اور سب سے پہلے تم ہی اِس کے منکر نہ بن جاؤ؛ اور تھوڑی قیمت کے عوض میری آیتیں نہ بیچو، اور میرے ہی غضب سے بچو؛ اور حق کو باطل سے نہ ملاؤ، (یہ حق کو چھپانے کی کوشش ہے) اور تم جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش نہ کرو؛ اور نماز کا اہتمام کرو

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿٤٩﴾

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٠﴾

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٢﴾

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿٥٣﴾

اور زکوٰۃ ادا کرو؛ اور اِن جھکنے والوں کے ساتھ تم بھی (خدا کے حضور میں) جھک جاؤ۔ کیا تم لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، دراں حالیکہ تم کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہو؟ پھر کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ اور (اِس راہ پر چلنے کے لیے) صبر اور نماز سے مدد چاہو، اور اِس میں شبہ نہیں کہ یہ سب بہت بھاری ہے، مگر اُن کے لیے بھاری نہیں ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں، جنھیں خیال ہے کہ اُنھیں اپنے پروردگار سے ملنا ہے اور اُن کو (ایک دن) اُسی کی طرف پلٹ کر جانا بھی ہے۔ 46-40

اے بنی اسرائیل، میری اُس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی تھی اور اِس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی، اور اُس دن سے ڈرو، جب کوئی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اُس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اُس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ لوگوں کو کوئی مدد ہی ملے گی۔ 48-47

اور یاد کرو، جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے چھڑایا۔ وہ تمھیں برے عذاب چکھاتے تھے، تمھارے بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ذبح کر دیتے تھے اور تمھاری عورتیں جیتی رکھتے تھے اور (تمھیں) اِس (عذاب سے چھڑانے) میں تمھارے پروردگار کی طرف سے (تمھارے لیے) بڑی عنایت تھی۔ 49

وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ اِنَّکُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ بِاتِّخَاذِکُمُ الۡعِجۡلَ فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰی بَارِئِکُمۡ فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ عِنۡدَ بَارِئِکُمۡ ؕ فَتَابَ عَلَیۡکُمۡ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۵۴﴾

وَ اِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾

ثُمَّ بَعَثۡنٰکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾ وَ ظَلَّلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡغَمَامَ وَ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰی ؕ کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰکُمۡ ؕ وَ مَا ظَلَمُوۡنَا وَ لٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۵۷﴾

وَ اِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃَ فَکُلُوۡا مِنۡہَا حَیۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ نَّغۡفِرۡ لَکُمۡ خَطٰیٰکُمۡ ؕ وَ سَنَزِیۡدُ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَیۡرَ الَّذِیۡ قِیۡلَ لَہُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۵۹﴾

اور یاد کرو، جب ہم نے تمھیں ساتھ لے کر دریا کو چیر دیا اور اِس طرح تمھیں بچالیا اور فرعون کے لوگوں کو تمھارے دیکھتے دیکھتے ہم نے اُسی دریا میں غرق کر دیا۔50

اور یاد کرو، جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھیرایا۔ پھر اُس کے پیچھے تم نے وہ بچھڑا بنالیا اور اُس وقت تم اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے۔ پھر اِس کے بعد بھی ہم نے تمھیں معاف کر دیا، اِس لیے کہ تم شکر کرنے والے بن جاؤ۔52-51

اور یاد کرو، جب ہم نے موسیٰ کو کتاب، یعنی (حق و باطل کے لیے) فرقان عطا فرمائی، اِس لیے کہ (اِس کے ذریعے سے) تم ہدایت حاصل کرو۔53

اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: میری قوم کے لوگو، تم نے یہ بچھڑا بنا کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اِس لیے اب اپنے خالق کی طرف لوٹو اور (اِس کے لیے) اپنے اِن لوگوں کو (اپنے ہاتھوں سے) قتل کرو۔ یہ تمھارے لیے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے۔ (چنانچہ تم نے یہ کیا) تو اُس نے تمھاری توبہ قبول فرمائی۔ بے شک، وہی بڑا معاف کرنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔54

اور یاد کرو، جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ، ہم تمھاری بات کا ہرگز یقین نہ کریں گے، جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں۔ اِس پر تم کو کڑک نے آلیا اور تم دیکھتے رہ گئے۔ پھر تمھاری اِس موت کے بعد ہم نے تمھیں اٹھا کھڑا کیا، اِس لیے کہ تم شکر گزار بن کر رہو۔ اور تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارے، کھاؤ یہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمھیں دی ہیں۔ (افسوس کہ

وَاِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡحَجَرَ ؕ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡہُ اثۡنَتَا عَشۡرَۃَ عَیۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَہُمۡ ؕ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰہِ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۶۰﴾

جن پر یہ عنایت ہوئی، اُنھوں نے اِس کی ناقدری کی) اور (اِس طرح) اُنھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے۔ 57-55

اور یاد کرو، جب ہم نے کہا کہ اِس بستی میں داخل ہو جاؤ، پھر اِس میں سے جہاں سے چاہو، مزے سے کھاؤ اور (یاد رکھو کہ) اِس کے دروازے میں (عجز کے ساتھ) سر جھکائے ہوئے داخل ہونا اور دعا کرنا کہ (پروردگار)، ہمارے گناہ بخش دے، ہم تمھارے گناہ بخش دیں گے اور (تم میں سے) وہ لوگ جو اچھا رویہ اختیار کریں گے، اُن پر عنقریب ہم اور بھی عنایت فرمائیں گے۔ پھر جو بات اُن سے کہی گئی تھی، ظالموں نے اُسے ایک دوسری بات سے بدل دیا۔ چنانچہ اِن ظلم کرنے والوں پر ہم نے آسمان سے عذاب اتارا، اُن نافرمانیوں کے باعث جو وہ کر رہے تھے۔ 59-58

اور یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا: اپنی لٹھیا اِس پتھر پر مارو۔ (اُس نے ماری) تو اُس سے بارہ چشمے بہ نکلے، اِس طرح کہ ہر گروہ نے اپنے لیے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔ اللہ کی اِس روزی سے کھاؤ اور پیو، (اے بنی اسرائیل)، اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔ 60

[باقی]

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

حضرت ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے فرمایا: وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور اِس کے لیے اچھی بات کہے یا کسی اچھی بات کو بڑھا کر بیان کر دے۔ (ترمذی، رقم 1857)

— 2 —

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچائی کو اختیار کرو، اِس لیے کہ سچائی نیکی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ (یاد رکھو)، آدمی سچ بولتا ہے، پھر بولتے بولتے اللہ کے نزدیک 'صدیق' لکھ دیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ سے بچو، اِس لیے کہ جھوٹ گناہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور گناہ دوزخ میں لے جاتا ہے۔ (یاد رکھو)، آدمی جھوٹ بولتا ہے، پھر بولتے بولتے اللہ کے نزدیک 'کذاب' لکھ دیا جاتا ہے۔ (مسلم، رقم 4727)

— 3 —

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں، اگرچہ وہ روزے رکھتا ہو، نمازیں پڑھتا ہو اور خود کو مسلمان سمجھتا ہو: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب امانت لے تو اُس میں خیانت کرے۔ (مسند احمد، رقم 8484)

مقامات

جاوید احمد غامدی

میرے بعد

میرا آبائی وطن اگرچہ ضلع سیالکوٹ کا ایک قصبہ داؤد ہے، لیکن میری پیدایش پاک پتن کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی اور میں اِسی شہر اور اِس کے سواد میں اُس عمر کو پہنچا جب دماغ کبھی کبھی سوچنا بند کر دیتا اور دل کبھی کبھی دھڑکنا بھول جاتا ہے اور ہم اِس کے نتیجے میں جو کچھ کرتے ہیں، اُس پر آپ ہی حیران ہوتے ہیں:

واے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

آج سے کم و بیش بیس سال پہلے اِسی شہر کے ایک مدرسے میں، میں چھٹی یا ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ درس نظامی کی کتابیں بھی اُس وقت تک میں نے غالباً ”کافیہ“ اور ”شرح جامی“ تک پڑھ لی تھیں۔ شہرستان علم کے در وا ہو چکے تھے اور میں اب کوچہ و بازار کی سیر دیکھنے کے لیے ہر روز عصر کے بعد شہر کی میونسپل لائبریری جاتا تھا۔ میرا گھر مضافات میں تھا۔ میں وہاں سے چل کر روزانہ پیدل لائبریری پہنچتا۔ شوق طلب بھی کیا چیز ہے۔ میرا یہ معمول برسوں رہا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ طبیعت نے کبھی خستگی کی شکایت کی ہو:

طالباں را خستگی در راہ نیست
عشق خود راہ ست وہم خود منزل ست

لائبریری کے راستے میں، میں نے ایک روز دیکھا کہ ایک بنک کے دروازے پر پہرا دینے والے سنتری کی نگاہیں دور تک میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ چھوٹی عمر تھی، دل و دماغ اِس صورت حال سے پہلی مرتبہ خوف و حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دوچار ہوئے۔ اگلے کئی روز یہی ہوا تو خوف و حیرت پر تجسس نے غلبہ پالیا۔ میں چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر اِس کی وجہ معلوم کروں، لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ بھی، معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن راہ نہیں پاتا۔ گویا وہی معاملہ تھا جو غالب کے ساتھ بارگاہ عشق میں ہوا تھا:

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو

بہت دن گزر گئے۔ ایک شام میں لائبریری سے واپس آرہا تھا۔ میرے ہاتھ میں خلافت کے موضوع پر ایک علمی کتاب تھی۔ میں راہ چلتے اُس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ مجھے خیال نہیں ہوا کہ بنک قریب آگیا ہے۔ اچانک میں نے دیکھا، وہ میرا راستہ روکے کھڑا ہے۔ میری نگاہ اُس کے چہرے پر پڑی۔ اُس کی ڈاڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اُس نے غالباً ابھی وضو کیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور اُس کی پیشانی پر سجدوں کا جمال تھا۔ بڑی محبت کے ساتھ اُس نے مجھ سے پوچھا: تم یہ کتاب پڑھو گے؟ تم نصاب کی کتابوں کے علاوہ اِس طرح کی علمی کتابیں بھی پڑھتے ہو؟ میں نے اقرار میں سر ہلایا تو اُس نے کہا: تمھارے ہاتھ میں ایک دن میں نے عربی کی ایک کتاب بھی دیکھی تھی۔ تم عربی جانتے ہو؟ جانتا ہوں، میں نے جواب دیا۔ تم نے عربی کہاں پڑھی ہے؟ اُس نے عربی میں مجھ سے سوال کیا تو میں حیران رہ گیا۔ لمحے بھر کے لیے مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں ہوا۔ میں کبھی اُسے دیکھتا اور کبھی اُس کے جسم پر سنتری کی وردی کو دیکھتا۔ میں نے خواص کے لباس میں جاہل دیکھے تھے، یہ میرے لیے پہلا تجربہ تھا کہ میں عوام کے لباس میں ایک عالم کو دیکھ رہا تھا۔

تم جو کتاب لے کر جارہے ہو، اِسے پڑھ لو۔ یہ ایک بڑے آدمی کی کتاب ہے۔ میں تمھیں ایک اور کتاب دوں گا جس میں اِس کتاب پر علمی تنقید کی گئی ہے۔ تم کوئی رائے قائم کرنے سے

پہلے اِسے بھی پڑھ لو۔ علم کی دنیا میں اشخاص کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہاں ساری اہمیت صرف دلیل کو حاصل ہے۔

اِس کے دوسرے دن جو کتاب اُنھوں نے مجھے دی، میں نے اُسی دن اُسے ختم کر لیا۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا جب میں دلیل کی اہمیت سے واقف ہوا۔ میری یہی واقفیت آج بھی میری زندگی کی سب سے بڑی متاع ہے۔ میں نے اِسے ایک سنتری سے حاصل کیا تھا۔ بعد میں، میں نے لاہور کی سب سے بڑی درس گاہ میں فلسفہ اور انگریزی ادب کی تعلیم پائی۔ اِس سے بڑی کوئی چیز، حقیقت یہ ہے کہ میں وہاں سے بھی حاصل نہ کر سکا۔ میں نے دوران تعلیم میں بارہا سوچا: کاش، میرے سب ہم جماعت اور استاد بھی کبھی لائبریری جاتے ہوئے اِس راستے سے گزرے ہوتے۔

کئی سال بعد، پچھلے ماہ میں پاک پتن گیا۔ ولی محمد صاحب سے اُسی بنک کے دروازے پر ملاقات ہوئی۔ وہ آج بھی وہیں کھڑے تھے جہاں بیس برس پہلے میں نے اُنھیں دیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم، اُن کی درس گاہ سے کوئی اور بھی فارغ ہوا یا:

ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

[1986ء]

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(4)

—1—

انفس و آفاق میں
معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

قرآنِ مجید میں بیش تر مقامات پر 'آیة' کا لفظ اللہ کی اُن نشانیوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جو انفس و آفاق میں ظاہر و باہر ہیں اور جن کا تعلق اللہ کی قدرت کے عادی امور سے ہے۔ اپنی

حقیقت کے اعتبار سے بلاشبہ، یہ غیر معمولی ہیں، لیکن عام، مسلسل اور مستقل ظہور کے باعث یہ معمول کے واقعات اور مشاہدات کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً یہ لوگوں کے لیے حیرت و استعجاب یا غور و فکر کا باعث نہیں بنتیں۔ تاہم، چونکہ یہ قطعی، واضح، معلوم و معروف اور ناقابلِ تردید ہوتی ہیں، اِس لیے قرآنِ مجید اِن کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اِن کی بنا پر لوگوں کو اعترافِ حق کی دعوت دیتا ہے۔ کائنات میں ہر سو آشکارا یہ آیاتِ الٰہی قرآن میں جا بجا مذکور ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ کا مردہ زمین سے لہلہاتے کھیت پیدا کرنا، انسان کو مٹی کے خمیر سے تخلیق کرنا، اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنانا اور پھر دونوں کے مابین موافقت اور سازگاری پیدا کرنا، آسمانوں اور زمین کو تخلیق کر کے اُن میں موافقت پیدا کرنا، آسمانوں کو ستونوں کے بغیر کھڑا کرنا، سورج اور چاند کو ایک قانون کا پابند کرنا، زمین کو بچھانا اور اُس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑنا، لوگوں کے اندر باہمی شناخت کے لیے رنگ و نسل اور زبانوں کا اختلاف رکھنا، آرام کے لیے رات اور کام کے لیے دن تخلیق کرنا، آسمانی بجلیوں سے خوف اور امید کی کیفیت میں مبتلا کرنا اور آسمان سے پانی برسا کر مردہ زمین کے اندر زندگی پیدا کر دینا اِسی نوعیت کی آیاتِ بینات کی مختلف صورتیں ہیں۔

سورۂ روم (30) میں آیات 19 تا 25 ایسا مقام ہے، جہاں اِس نوعیت کی متعدد آیات سے استشہاد اور استدلال کیا گیا ہے۔ اِس مقام پر 'وَمِنْ اٰیٰتِہٖ' (اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے) کے الفاظ کو بار بار دہرا کر اُن عظیم نشانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے، جنھیں انسان محض اِس وجہ سے نظر انداز کر دیتا ہے کہ وہ اُس کے لیے معمول کا مشاہدہ اور روز مرہ کا تجربہ بن جاتی ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ؕ وَکَذٰلِکَ تُخْرَجُوْنَ. وَ مِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ.	"(تمھیں تعجب ہے کہ یہ کس طرح ہو گا؟ دیکھتے نہیں ہو کہ) وہ زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے اور زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ و شاداب کر دیتا ہے۔ اِسی طرح تم بھی نکالے جاؤ گے۔

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر دیکھتے دیکھتے تم انسان بن کر (زمین میں) پھیل جاتے ہو۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ.

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کرو اور اِس کے لیے اُس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ اِس میں، یقیناً ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو غور کرنے والے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ.

زمین اور آسمانوں کی پیدایش اور تمھاری بولیوں اور رنگوں کا اختلاف بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس میں، یقیناً علم والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ.

اِسی طرح تمھارا رات اور دن میں سونا اور اُس کا فضل تلاش کرنا بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس میں، یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو (دل کے کانوں سے) سنتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ تمھیں بجلیاں دکھاتا ہے، جو خوف بھی پیدا کرتی ہیں اور امید بھی، اور آسمان

لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ.

سے پانی برساتا ہے، پھر اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ اِس میں، یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ۭ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ.

(الروم30:25-19)

اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ زمین و آسمان اُسی کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جب وہ زمین سے نکلنے کے لیے تم کو ایک ہی بار پکارے گا تو سنتے ہی نکل پڑو گے۔"

اِس مقام پر جن نشانیوں کا ذکر آیا ہے، اُن کا مختصر تذکرہ درجِ ذیل ہے۔ اِس سے لفظِ 'آیۃ' کے مفہوم کے مذکورہ بالا اطلاق کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

1۔ انسان کی تخلیق اور نشو و نما

اِن میں پہلی آیت یا نشانی انسان کی خلقت اور اُس کی افزایش نسل کو بتایا ہے۔ فرمایا ہے: "اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر دیکھتے دیکھتے تم انسان بن کر پھیل جاتے ہو۔" مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنی تخلیق پر غور کرے تو اُسے صاف معلوم ہو گا کہ اِس کا وجود مٹی میں پائے جانے والے بے جان عناصر سے تشکیل پایا ہے۔ اللہ نے اِن مردہ ذرات کو زندہ خلیوں میں تبدیل کیا اور پھر اُن کے اندر روح پھونک کر جیتا جاگتا باشعور انسان بنا دیا۔ اور فقط اُسے ہی نہیں بنایا، بلکہ اُس کے وجود کو سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں انسانوں کو ظہور میں لانے کا ذریعہ بھی بنا دیا۔

امام امین احسن اصلاحی اِس نشانی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی تم کو جن حقائق کے ماننے کی دعوت دی جا رہی ہے، وہ تمام تر تمھارے خالق کی قدرت و حکمت پر مبنی ہیں تو اُس کی قدرت و حکمت کے ثبوت کے لیے تم کسی خارجی دلیل کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟ اِس کی سب سے بڑی دلیل تو خود تمھاری خلقت ہی کے اندر موجود ہے۔ اُس نے تم کو جامد مٹی سے پیدا کیا اور پھر تم زندہ اور عقل و شعور رکھنے والی ہستی بن کر تمام

روے زمین پر پھیل گئے... یعنی غور کرو، کہاں خشک مٹی اور کہاں جیتا جاگتا انسان، دیکھتے دیکھتے خدا کی قدرت نے اسی مٹی سے ایک پورا جہان آباد کر دیا!'' (تدبر قرآن 6/85-84)

2۔ انسان کی جنس سے اُس کے جوڑے کی تشکیل

دوسری نشانی یہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ نے انسان کو جوڑے کی صورت میں تخلیق کیا ہے اور اِس کے دونوں اجزا میں باہم محبت و مودت پیدا کی ہے۔ اِس کے لیے 'خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً' کے الفاظ آئے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ہی ساخت پر پیدا نہیں کیا، بلکہ اِسے مرد و عورت کی دو مختلف ساختوں پر پیدا کیا ہے۔ دونوں اپنی روح اور نفس کے لحاظ سے یکساں ہیں، مگر اپنے اعضا و جوارح اور عملی خصائص کے اعتبار سے مختلف اور متنوع پہلوؤں کے حامل ہیں۔ اِس صنفی اختلاف کے باوجود اُن کی ضرورتیں ایک دوسرے سے وابستہ کی ہیں اور آپس میں انس و محبت اور رحم و کرم کے جذبات پیدا کیے ہیں۔ پھر اِن کی توسیع سے خاندان اور معاشرے کو وجود بخشا ہے۔

استاذِ گرامی اِس نشانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یعنی انسان کی صرف ایک صنف نہیں بنائی، بلکہ اُسے دو صنفوں کی صورت میں پیدا کیا اور دونوں کے اندر الگ الگ انفرادی خصوصیات رکھیں، لیکن پھر اُن میں ایسی مناسبت پیدا کر دی کہ دونوں ایک دوسرے سے تسکین و راحت حاصل کرتے ہیں، جس کے لیے محبت و رحمت کا ایسا جذبہ اُن کے اندر ودیعت کر دیا کہ اُنھیں وہ ایک دوسرے کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کا خیر خواہ، ہم درد و غم خوار اور شریکِ رنج و راحت بنا دیتا ہے۔'' (البیان 4/52)

امام امین احسن اصلاحی نے اِس آیت کو چار مختلف نشانیوں کے طور پر واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اِس کے اندر ایک واضح نشانی تو اِس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کائنات میں ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنے مقصدِ وجود کی تکمیل اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر کرتی ہے۔ اِس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اِس دنیا کا بھی ایک جوڑا ہے، جس کو آخرت کہتے ہیں۔ اِسی آخرت سے اِس دنیا کی غایت کی تکمیل ہوتی ہے۔ دوسری نشانی اِس کے اندر یہ ہے کہ ہمارا خالق نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔ اُس نے ہمارے اندر جوڑے کی طلب دی تو ہماری ہی

جنس سے ہمارا جوڑا بھی اُس نے پیدا کیا اور پھر دونوں کے اندر محبت و ہم دردی کے جذبات بھی ودیعت فرمائے تاکہ دونوں دو قالب یک جان ہو کر زندگی بسر کریں۔ تیسری نشانی اِس کے اندر یہ ہے کہ اِس کائنات کے اضداد کے اندر نہایت گہرا توافق اور ایک بالاتر مقصد کے لیے نہایت عمیق سازگاری پائی جاتی ہے، جو اِس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اِس کا خالق و مالک ایک ہی ہے، جو اپنی حکمت کے تحت اِس کائنات کے اضداد میں توفیق پیدا کرتا ہے۔ چوتھی نشانی اِس کے اندر یہ ہے کہ اِن لوگوں کا خیال بالکل احمقانہ ہے، جو سمجھتے ہیں کہ اِس کائنات کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر اِس کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے تو اِس کے اضداد میں یہ حیرت انگیز توافق کہاں سے پیدا ہوا؟ یہ تو اِس بات کی صاف شہادت ہے کہ ایک قادر و حکیم ہستی ہے، جو اِس پورے نظام کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہی ہے۔'' (تدبر قرآن 6/85)

3۔ زمین اور آسمانوں کی تخلیق

زمین اور آسمانوں کی پیدایش اور انسانوں کی زبانوں اور رنگوں کے اختلاف کو بھی اللہ کی نشانیاں قرار دیا ہے۔ اِس کے لیے 'خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی زمین اور آسمانوں کی تخلیق بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس میں علم والوں کے لیے، یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انسان کی تخلیق کی طرح کائنات کی تخلیق بھی اللہ کی معرفت کی عظیم نشانی ہے۔ یعنی جب وہ سر جھکا کر اپنے وجود پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے یہ محدود سا وجود اللہ کی کرشمہ سازیوں کا مظہر دکھائی دیتا ہے اور جب وہ سر اٹھا کر اپنے گرد و پیش کا نظارہ کرنا چاہتا اور آسمان کی وسعتوں پر نظر ڈالتا ہے تو اُس کی نظر تھک کر واپس لوٹ آتی ہے۔ اُسے اندازہ ہوتا ہے کہ زمین کے دفینے اور آسمان کی وسعتیں اُس کے شعور سے بلند اور تصورات سے ماورا ہیں۔ امام امین احسن اصلاحی آسمانوں اور زمین کی نشانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اگر لوگ غور کریں تو اُن کو یہ چیز صاف نظر آئے گی کہ اِس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت مضمر ہے۔ ایک طرف آسمانوں کی ایک وسیع اور ناپیدا کنار کائنات ہے اور دوسری طرف یہ کرۂ زمین ہے۔ بہ ظاہر دونوں میں کتنی دوری ہے، لیکن اِس دوری کے باوجود دونوں میں اتنا گہرا اتصال ہے کہ کوئی عاقل یہ تصور نہیں کر سکتا کہ دونوں الگ الگ خالقوں کی قدرت سے وجود میں آئے اور الگ الگ ارادوں کے تحت گردش کر رہے ہیں، بلکہ اِن کی باہمی سازگاری

پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ ایک ہی قدیر و حکیم دونوں پر متصرف ہے اور دونوں کو ایک مشترک مقصد کے لیے مسخر کیے ہوئے ہے۔" (تدبر قرآن 6/86)

4۔ انسانوں کی زبانوں اور رنگوں میں اختلاف

انسانوں کی بولیوں اور رنگ و نسل کا اختلاف بھی اللہ کی ایک عظیم نشانی ہے۔ یہ اختلاف جہاں پہچان اور تعارف کا فائدہ دیتا ہے، وہاں امتحان اور آزمایش کی مختلف صورتوں کا باعث بھی بنتا ہے۔ صاحبِ "تفہیم القرآن" مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے زبان و رنگ کے اختلاف کی نشانی کو بہت وضاحت سے سمجھایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یعنی باوجود یکہ تمھارے قوائے نطقیہ یکساں ہیں، نہ منہ اور زبان کی ساخت میں کوئی فرق ہے اور نہ دماغ کی ساخت میں، مگر زمین کے مختلف خطوں میں تمھاری زبانیں مختلف ہیں، پھر ایک ہی زبان بولنے والے علاقوں میں شہر شہر اور بستی بستی کی بولیاں مختلف ہیں، اور مزید یہ کہ ہر شخص کا لہجہ اور تلفظ اور طرزِ گفتگو دوسرے سے مختلف ہے، اِسی طرح تمھارا مادۂ تخلیق اور تمھاری بناوٹ کا فارمولا ایک ہی ہے، مگر تمھارے رنگ اِس قدر مختلف ہیں کہ قوم اور قوم تو درکنار، ایک ماں باپ کے دو بیٹوں کا رنگ بھی بالکل یکساں نہیں ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف دو ہی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ لیکن اِسی رخ پر آگے بڑھ کر دیکھیے تو دنیا میں آپ ہر طرف اتنا تنوع (Variety) پائیں گے کہ اِس کا احاطہ مشکل ہو جائے گا۔ انسان، حیوان، نباتات اور دوسری تمام اشیا کی جس نوع کو بھی آپ لے لیں، اُس کے افراد میں بنیادی یکسانی کے باوجود بے شمار اختلافات موجود ہیں، حتیٰ کہ کسی نوع کا بھی کوئی ایک فرد دوسرے سے بالکل مشابہ نہیں ہے، حتیٰ کہ ایک درخت کے دو پتوں میں بھی پوری مشابہت نہیں پائی جاتی۔ یہ چیز صاف بتا رہی ہے کہ یہ دنیا کوئی ایسا کارخانہ نہیں ہے، جس میں خودکار مشینیں چل رہی ہوں اور کثیر پیداآوری (Mass Production) کے طریقے پر ہر قسم کی اشیا کا بس ایک ایک ٹھپہ ہو، جس سے ڈھل ڈھل کر ایک ہی طرح کی چیزیں نکلتی چلی آ رہی ہوں۔ بلکہ یہاں ایک ایسا زبردست کاری گر کام کر رہا ہے، جو ہر چیز کو پوری انفرادی توجہ کے ساتھ ایک نئے ڈیزائن، نئے نقش و نگار، نئے تناسب اور نئے اوصاف کے ساتھ بناتا ہے اور اُس کی بنائی ہوئی ہر چیز اپنی جگہ منفرد ہے۔ اُس کی قوتِ ایجاد ہر آن، ہر چیز کا ایک نیا ماڈل نکال رہی ہے، اور اس کی

صناعی ایک ڈیزائن کو دوسری مرتبہ دوہرانا اپنے کمال کی توہین سمجھتی ہے۔ اِس حیرت انگیز منظر کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر دیکھے گا، وہ کبھی اِس احمقانہ تصور میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ اِس کائنات کا بنانے والا ایک دفعہ اِس کارخانے کو چلا کر کہیں جا سویا ہے۔ یہ تو اِس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ ہر وقت کارِ تخلیق میں لگا ہوا ہے اور اپنی خلق کی ایک ایک چیز پر انفرادی توجہ صرف کر رہا ہے۔'' (تفہیم القرآن 3/ 747-746)

5۔ گردشِ لیل و نہار

رات اور دن کے آنے جانے کو بھی آیات میں شمار کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: ''اِسی طرح تمھارا رات اور دن میں سونا اور اُس کا فضل تلاش کرنا بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس میں، یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو (دل کے کانوں سے) سنتے ہیں۔'' لیل و نہار کی آمد و شد، بہ ظاہر نہایت معمول کا واقعہ ہے، مگر اِس کے اندر پروردگار کے غیر معمولی علم و حکمت اور ربوبیت کی حقیقت پوری طرح آشکار ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ جو وجود اُس نے تخلیق کیا ہے، اُس کو ذہنی، روحانی اور جسمانی آرام کی ضرورت ہے۔ اِس کے بغیر وہ زیادہ دیر تک کارکردگی کے قابل نہیں رہتا۔ پھر ماحول کی یکساں اور مستقل کیفیت زندگی کی سرگرمی کو بے کیف بنا دیتی ہے۔ انسان کی اِس ڈھب پر تخلیق کا تقاضا ہے کہ اُس کے رہنے کے لیے تیار کی گئی سکونت گاہ اِس رنگ ڈھنگ کے مطابق ہو۔ یعنی خالق اگر علیم و حکیم ہے تو وہ مخلوق کی ضرورتوں سے کماحقہ آگاہ ہو گا اور کمال ربوبیت سے اُن کی تکمیل کا اہتمام بھی کرے گا۔ یہ ضرورت اور اِس کی تکمیل کے اسباب دلیل ہیں کہ انسان اور کائنات اتفاقاً وجود میں نہیں آ گئے، بلکہ اِنھیں ایک نہایت علیم و حکیم ہستی نے تخلیق کیا ہے۔

استاذِ گرامی اِس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''فرمایا کہ وہ اگر تنہا اِسی بات پر غور کریں کہ اُن کے خالق نے انسانی جسم کے لیے نیند اور آرام کی ضرورت اور معاش کی جدوجہد کو رات اور دن میں تقسیم کر کے کس رحمت و شفقت کے ساتھ اُنھیں اور اُن کے ماحول کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ کیا یہ چیز صاف صاف ایک رب رحیم و کریم کے وجود کا پتا نہیں دے رہی؟ کیا اِس کے بعد بھی انسان کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقاً ہو گیا ہے یا اِس میں ایک سے زیادہ خداؤں کی خدائی متصور ہو سکتی ہے یا اِس کائنات کا خالق

اِسے یوں ہی ختم ہو جانے دے گا؟ اِس میں، اگر غور کیجیے تو مخالفین کے رویے پر ایک نوعیت کی تعریض بھی ہے کہ سنتے بھی ہیں تو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اندھے اور بہرے ہو کر مخالفت کے لیے آستینیں چڑھا لیتے ہیں۔'' (البیان 4/ 55*54)

سورۂ یونس میں اِس نشانی کو کائنات کے انجام کی ایک علامت کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ فِی اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ.(6:10)	''یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور جو کچھ زمین اور آسمانوں میں اللہ نے پیدا کیا ہے، اُس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو ڈرتے ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ ایام کی گردش اِس امر کی نشانی ہے کہ کائنات ایک عظیم نتیجے تک پہنچنے والی ہے، یہ بے مقصد ہر گز نہیں ہے۔ امام امین احسن اصلاحی نے بیان کیا ہے:

''اختلافِ لیل و نہار سے اُس تعاقب کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے، جو وہ ایک دوسرے کا پوری سرگرمی سے کر رہے ہیں، جس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ یہ گردش بے غایت و بے مقصد نہیں ہے، بلکہ ایک عظیم نتیجہ پر منتہی ہونے والی ہے۔ دوسرے، اِس عظیم نظام ربوبیت کی طرف بھی اِس میں اشارہ ہے، جو رات اور دن کے اختلافِ مزاج کے اندر مضمر ہے کہ دن انسان کے لیے معاش و معیشت کی سرگرمیوں کا میدان گرم کرتا ہے اور رات اُس کے لیے راحت و سکون کا بستر بچھاتی ہے۔ اِس نظام پر جو شخص بھی غور کرتا ہے، وہ لازماً اِس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ اضداد کے اندر ایک مشترک مقصد کے لیے یہ حیرت انگیز توافق اُسی شکل میں وجود میں آسکتا ہے، جب یہ مانا جائے کہ یہ سارا کارخانہ صرف ایک قادر و قیوم کے ارادے کے تحت کام کر رہا ہے اور پھر اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس نے ربوبیت و پرورش کا یہ سارا نظام کھڑا کیا ہے اور اُس کو اِس اہتمام سے چلا رہا ہے، وہ انسان کو مطلق العنان اور غیر مسئول نہیں چھوڑے گا، بلکہ اِس کے بعد ایک ایسا دن لازماً آنا ہے، جس میں وہ اِس ربوبیت کا حق پہچاننے والوں کو اُن کی حق شناسی کا انعام دے گا اور اِس سے بے پروا رہنے والوں کو جہنم میں جھونک دے گا۔ یہی نتیجہ اِس کائنات کے تمام اجزا اور اِس کے تمام اضداد پر غور کرنے سے حاصل

ہوتا ہے اور یہی حاصل ہے، جو انسان کی رہنمائی آخرت اور اِس جزا و سزا کی طرف کرتا ہے۔'' (تدبر قرآن 4/26)

6۔ بادلوں کی گرج چمک اور برسات

آسمان کے مختلف مظاہر بھی اللہ کی نشانیوں کے عکاس ہیں۔ بجلی چمک کر بارش کی خبر دیتی ہے۔ یہ بارش کسی بستی کے لیے رحمت کی برسات بنتی اور کسی بستی میں عذاب کا طوفان لے کر آتی ہے۔ اِس طرح بہ یک وقت آس اور امید اور خوف و ہراس کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ ایک ہی چیز ہے، جس کو پروردگار چاہے تو انعام کی صورت دے دے اور چاہے تو سزا بنا دے۔

استاذِ گرامی لکھتے ہیں:

''یعنی (یہ بجلیاں) اپنے وجود سے تعلیم دیتی ہیں کہ نعمت و نقمت، سب خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ جزا و سزا، دونوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور اُس کے لیے اپنی جس نعمت کو چاہے، نقمت اور نقمت کو نعمت میں تبدیل کر سکتا ہے۔'' (البیان 4/55)

یہی معاملہ بارش کا ہے۔ وہ رحمت اور بخشش کا باعث بھی بنتی ہے اور قہر اور غضب کا بھی۔ اِس کا فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ کب اُسے کھیتوں کھلیانوں کی آب یاری کا حکم دیتا ہے اور کب کھڑی فصلوں کو بہالے جانے کا فرمان جاری کرتا ہے۔ یہاں بارش کے حوالے سے 'فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا' (پھر اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔) کے الفاظ آئے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''یہ چیز ایک طرف حیات بعد الموت کی نشان دہی کرتی ہے، اور دوسری طرف یہی چیز اِس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ خدا ہے، اور زمین و آسمان کی تدبیر کرنے والا ایک ہی خدا ہے۔ زمین کی بے شمار مخلوقات کے رزق کا انحصار اُس پیداوار پر ہے، جو زمین سے نکلتی ہے۔ اُس پیداوار کا انحصار زمین کی صلاحیتِ بار آوری پر ہے۔ اِس صلاحیت کے روبکار آنے کا انحصار بارش پر ہے، خواہ وہ براہِ راست زمین پر برسے، یا اُس کے ذخیرے سطحِ زمین پر جمع ہوں، یا زیرِ زمین چشموں اور کنوؤں کی شکل اختیار کریں، یا پہاڑوں پر یخ بستہ ہو کر دریاؤں کی شکل میں بہیں۔ پھر

اِس بارش کا انحصار سورج کی گرمی پر، موسموں کے رد و بدل پر، فضائی حرارت و برودت پر، ہواؤں کی گردش پر، اور اُس بجلی پر ہے، جو بادلوں سے بارش برسنے کی محرک بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بارش کے پانی میں ایک طرح کی قدرتی کھاد بھی شامل کر دیتی ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک کی اِن تمام مختلف چیزوں کے درمیان یہ ربط اور مناسبتیں قائم ہونا، پھر اِن سب کا بے شمار مختلف النوع مقاصد اور مصلحتوں کے لیے صریحاً ساز گار ہونا، اور ہزاروں لاکھوں برس تک اِن کا پوری ہم آہنگی کے ساتھ مسلسل ساز گاری کرتے چلے جانا، کیا یہ سب کچھ محض اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کسی صانع کی حکمت اور اُس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اُس کی غالب تدبیر کے بغیر ہو گیا ہے؟ اور کیا یہ اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ زمین، سورج، ہوا، پانی، حرارت، برودت، اور زمین کی مخلوقات کا خالق اور رب ایک ہی ہے؟"

(تفہیم القرآن 3/ 749-748)

7۔ زمین و آسمان کا قیام و دوام

زمین و آسمان کا قیام و استحکام بھی آیاتِ الٰہی میں سے ہے۔ یہ اللہ کے حکم سے قائم و دائم ہیں۔ اُس کا حکم ہو گا تو اِن کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ پھر جب وہ انسانوں کو زمین سے نکلنے کا حکم دے گا تو انسانوں کے پاس سر تابی کی کوئی گنجایش نہیں ہو گی۔ اُن کا وجود آپ سے آپ اُس کی آواز پر لبیک کہہ اٹھے گا۔ نہ آسمان پروردگار کی ندا کو انسانوں تک پہنچنے سے روک پائے گا اور نہ زمین اپنے اندر سے اُن کے نکلنے پر رکاوٹ ڈال سکے گی۔

'تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ' (زمین و آسمان اُسی کے حکم سے قائم ہیں) کے حوالے سے استاذِ گرامی لکھتے ہیں:

"اِس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے، اِس لیے کہ تم اگر سن سکو تو اتھاہ خلاؤں میں گردش کرتے ہوئے نجوم و کواکب اور سورج اور چاند اور تمھاری یہ زمین، سب بول کر بتا رہے ہیں کہ وہ کسی قائم رکھنے والے کی قدرت سے قائم ہیں اور کسی چلانے والے کے زور سے چل رہے ہیں۔" (البیان 4/ 55)

'ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ' (پھر جب وہ زمین سے نکلنے کے لیے تم کو

ایک ہی بار پکارے گا تو سنتے ہی نکل پڑو گے) کے ٹکڑے پر استاذِ گرامی کا حاشیہ ہے:

''یعنی دوسری مرتبہ پکارنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ زمین و آسمان کے قیام و استحکام میں خدا کی قدرت و حکمت کا اظہار جس حیرت انگیز طریقے سے اور جس اعلیٰ سطح پر دیکھ رہے ہو، وہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ وہ اگر ایک ہی پکار پکار دے تو ممکن نہیں ہے کہ زمین اُس کے حکم سے سرتابی کی جسارت کرے یا آسمان اُس سے سرِ مو انحراف کر سکے۔''

(البیان 4/56-55)

سورۂ روم میں اِس بیان کے خاتمۂ کلام کے طور پر فرمایا ہے کہ فقط مذکورہ اشیا اور معاملات ہی نہیں، بلکہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے، سب پر اللہ کا حکم قائم ہے۔ کوئی واقعہ اُس کے اذن کے بغیر رونما نہیں ہوتا۔ ہر چیز میں، ہر معاملے میں، ہر واقعے میں اُس کی صفات کی نشانیاں نمایاں ہیں، جو انسان کو آگاہ کرتی ہیں کہ وہی ہے، جس نے خلقت کی ابتدا کی ہے اور وہی اِس کا اعادہ کرے گا۔ اِس لیے انسان کو اِس کے دائرۂ قدرت سے فرار کی راہ نہیں ڈھونڈنی چاہیے۔ وہ زبردست بھی ہے اور حکمت والا بھی ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ. وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (الروم 30:27-26)

''زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، اُسی کے ہیں، سب اُسی کے فرماں بردار ہیں۔ وہی ہے، جو خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اُسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ اُس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ زمین اور آسمانوں میں سب سے بالاتر صفت اُسی کی ہے اور وہی عزیز و حکیم ہے۔''

امام امین احسن اصلاحی نے اِس مقام کی تفسیر میں لکھا ہے:

''فرمایا کہ وہی ہے، جو خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر وہی اُس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ تم سوچو تو اُس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہو کہ اُسی نے خلق کو وجود بخشا ہے تو اُس کے دوبارہ پیدا کیے جانے کو کیوں مستبعد خیال کرتے ہو؟ پہلا کام زیادہ مشکل ہے یا یہ دوسرا؟... فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں تمام اعلیٰ صفتوں کا اصلی حق دار

وہی ہے، کوئی دوسرا اُن صفات میں اُس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اِس کے بعد خاص طور پر اپنی دو صفتوں ـــ عزیز و حکیم ـــ کا حوالہ دیا کہ وہ ہر چیز پر غالب، سب سے بالاتر، اور اُس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں، اُس کے ارادے میں اِس کی حکمت کے سوا اور کوئی چیز بھی دخیل نہیں، اور اِس ساری کائنات میں کوئی نہیں، جو اُس کی صفات میں برابری کر سکے۔ اِس سے یہ بات لازمی نتیجہ کے طور پر آپ سے آپ نکل آئی کہ جب صفات میں کوئی اُس کی برابری کا نہیں تو اُس کے حقوق میں بھی کوئی اُس کی برابری کا نہیں قرار دیا جا سکتا۔" (تدبر قرآن 6/89)

[باقی]

ڈاکٹر عرفان شہزاد

احمد جاوید صاحب کے مذہبی افکار

ایک تنقیدی جائزہ

[”نقد و نظر“ کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

فلسفہ، تصوف اور علم دین کی تکون میں احمد جاوید صاحب کا مذہبی فکر کس رخ سے سامنے آتا ہے؟ فلسفیانہ تشکیک اور زبان کی دلالت کی عدم قطعیت پر اصرار کے ساتھ وہ ایمانیات کو کن بنیادوں پر استوار کر پاتے ہیں؟ ان کے فکر پر یہ ایک بڑا سوال ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اپنے ایک حالیہ لیکچر بعنوان ”آگے دیکھنا سیکھو“ میں اپنی فکری بنیادوں کا تعارف کراتے ہوئے اس کا جواب انھوں نے فراہم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خدا پر ایمان ”علم کی کسی بھی شرط سے بے نیاز“ ہو کر اختیار کیا جائے، اس کے بعد استدلال کی قوت فراہم کی جائے اور شعور کو ایمان سے ہم آہنگ کر لیا جائے۔

دیکھا جا سکتا ہے کہ اس فکر کی بنیاد بے علمی پر استوار کی گئی ہے۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں

تھا۔ فلسفیانہ تشکیک پر اعتماد کا نتیجہ ذرائع علم پر عدم اعتماد کی صورت میں نکلنا لازم ہے۔ اس کے بعد مذہبی بیانات پر ایمان لانے کی کوئی بنیاد نہیں رہتی۔ بے نتیجیت جہاں منتہاے کمالِ علم ہو، زبان کا ذریعہ جہاں گونگا نہیں تو 'لا یکاد یبین' قرار پائے، جہاں علم کا اثبات ہی محل نظر ٹھہرے، وہاں علمی بنیادوں پر ایمان لانے کا مباحثہ کیسے بار پا سکتا ہے؟ چنانچہ یہی راہ بچتی ہے کہ ایمان کو علم کا موضوع نہ بنایا جائے اور علمی شرائط سے بے نیاز ہو کر ایمان لانے اور بچانے کا مشورہ دیا جائے۔

اس غیر علمی اپروچ کو قرآن مجید ''بغیر علم'' اور ''بغیر حق'' جیسے الفاظ میں ہدف تنقید بناتا ہے۔ اپنے مخاطبین سے پوچھتا ہے کہ علمی شرائط پوری کیے بغیر وہ اپنے معتقدات کو کیوں تسلیم کیے ہوئے ہیں؟ ان کی بے علمی اور بے عقلی پر اصرار کے سبب ہی سے وہ خدا کے غضب کا شکار ہوئے۔

غور کیجیے کہ علمی شرائط سے بے نیازی کا یہ مقدمہ ایمان کے بعد دعوت دین کا مقدمہ بھی تحلیل کر دیتا ہے۔ مخاطبین سے کیا کہا جائے کہ کسی علمی شرط کا مطالبہ کیے بغیر اسلام کے خدا پر ایمان لے آؤ؟ دلائل بعد میں فراہم کیے جائیں گے! اُدھر سے بھی یہی جواب متوقع ہے کہ علم سے بے نیازی کی یہ سہولت انھیں بھی میسر ہونی چاہیے۔

ایمان باللہ یا ایمان بالغیب علم کا مسئلہ ہے۔ قرآن مجید خدا اور آخرت پر ایمان لانے کی جو بنیادیں فراہم کرتا ہے وہ علم، عقل اور فطرت کے مسلمات اور تاریخی شواہد پر مشتمل اور مبنی ہیں۔ ان کے ابلاغ لیے زبان کا جو واسطہ اختیار کرتا ہے، وہ واضح انسانی زبان، انسانی اسالیب اور محاورے پر مشتمل ہے۔ خدا کے کلام نے یہ تعینات اسی لیے قبول کیے کہ اس کا پیغام انسان کے لیے قابل فہم ہو سکے اور وہ پوری قطعیت سے قابل فہم ہے۔

ایک واضح کلام کا غلط یا درست فہم کلام کا نقص نہیں ہوتا، فہم کا نقص ہوتا ہے۔ اس سے کلام ظنی نہیں بن جاتا۔ لغت، اصولِ زبان، تناظرات بیان اور تدبر کا حق ادا کر کے فہم کو درست کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس زبان و بیان اور عقل و فہم کے مسلمات کی صورت میں وہ معیارات موجود ہوتے ہیں جس کی بنا پر ہم ایک کو ایلفائیڈ فہم کو درست اور دوسرے کو غلط قرار دیتے ہیں۔ یہ کام ہم ہر علم و فن اور روزمرہ کلام میں کرتے ہیں۔ یہی کام ہم قرآن مجید کے مفاہیم متعین کرنے میں کرتے ہیں۔

علمی و عقلی حریت کے اس دور میں الحاد کا چیلنج اس لیے بھی موثر ہوا کہ اہل ایمان کی اکثریت کے ہاں اپنے ایمان کی کوئی علمی بنیاد نہیں تھی۔ الحاد کا مقابلہ ایمان کو علمی بنیادوں پر استوار کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ مذاہب جو علمی بنیادوں سے محروم ہیں، یہ مجبوری ان کے پیروکاروں کی ہے کہ علمی شرائط سے بے نیاز ہو کر اپنے معتقدات کو بچائیں یا الحاد قبول کر لیں۔ اسلام پورے قد سے اپنی علمی بنیادوں پر استوار ہے۔ اسے علمی شرائط سے بے نیاز ہو کر تسلیم کر لینے کا مشورہ دینے کی ضرورت نہیں۔

مذہب کو بے علمی سے مان لینے کے مشورے کی دوسری وجہ مذہب کو بھی تہذیب کے دائرے میں شمار کر لینا ہے۔ مذہب تہذیبی روایت میں شامل ہوتا ہے، مگر خود تہذیبی روایت نہیں ہوتا۔ یہ ایک علم کا نام ہے اور اسے علم کے طریقے پر حاصل کیا جانا ہی اس کا حق ہے۔ روایت محض اس لیے مانی اور منوائی جاتی ہے کہ وہ تہذیبی میراث ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں یہ معیوب سمجھا جاتا ہے کہ والدین نیچے اور اولاد اونچی مسند پر بیٹھے ہوں۔ اس کا جواز اس کے سوا کچھ نہیں کہ روایت یہی ہے۔ لیکن مذہب کا معاملہ یوں نہیں۔ وہاں بتانا پڑتا ہے کہ کچھ غیبی باتوں کو بن دیکھے ہم کیوں مانتے ہیں۔

کلام میں تعیینِ معنی ایک حقیقت ہے۔ روز مرہ کی باتیں ہوں یا لین دین کے معاملات، یا عدالت میں قوانین اور تنازعات کے مباحث، کلام میں تعیینِ معنی کے امکان کو تسلیم کر کے پیش کیے جاتے اور اکثر اتفاق پر منتج ہوتے ہیں۔ اتفاق نہ ہو پائے تو وجہ زبان کو نہیں ٹھہرایا جاتا، عقلی، جذباتی، تناظراتی یا تعصباتی محرکات گنوائے جاتے ہیں۔ اختلاف فہم کلام کا خاصہ نہیں، قاری کا مسئلہ ہے جو بیش تر معاملات میں دور کر لیا جا سکتا ہے۔ دنیا انھی حقائق کو تسلیم کر کے چل رہی ہے، ورنہ ایک بڑا پاگل خانہ ہوتی جہاں کوئی کسی کو اپنی بات کا یقین نہ دلا سکتا۔

تعیینِ معنی کے منکرین خود اپنے موقف کی قطعیت کو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور اسی بنا پر لگاتے ہیں کہ ان کے کلام کو پوری تعیین اور قطعیت سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کوئی ابہام رہ جائے تو اسے واضح کیا جا سکتا ہے۔ تضادِ فکر و عمل کا یہ نمونہ اپنے فکر و فلسفے کے خلاف خود اپنی شہادت ہے۔

تعیینِ معنی سے گریز کا منطقی نتیجہ صداقت کی عدم تعیین اور موضوعیت ہے۔ یہ اتنا خوش کن

فلسفہ ہے، جس نے ہر کفر و گم راہی کو جواز فراہم کر دیا ہے۔ اس کے بعد دیانت داری کا تقاضا تو یہی ہے کہ کسی بھی بات پر ایمان و یقین نہ رکھا جائے، اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ علم کی کوئی شرط پوری کیے بغیر ہی خدا پر ایمان رکھ لیا جائے۔ اس پر مبارک شاہ صاحب کا شعر یاد آتا ہے:

بتا ان اہل ایماں کی سزا رکھی ہے کیا تو نے
خداوندا! جو تجھ کو احتیاطاً مان لیتے ہیں

احمد جاوید صاحب سے بجا طور پر جب بھی یہ سوال ہوا کہ تشکیکی فلسفوں پر ایمان لانے کے بعد حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کے باب میں اسلام کی صداقت کیسے فیصلہ کن ہو سکتی ہے، اس کے جواب میں انھوں نے جو افکار پریشاں پیش کیے ہیں، ان میں کسی قابل فہم جواب کا سرا نہیں ملتا۔

اپنے ایک اور لیکچر ''درجات فہم'' میں زبان کی عدم قطعیت کو ثابت کرتے ہوئے انھوں نے دو مثالیں پیش کیں: ایک یہ کہ قرآن مجید میں ''نماز ادا کرو'' کے مفہوم میں نماز سے متعلق کیفیات اور خالق کے ساتھ تعلق کی تمام جہتیں سمجھی نہیں جا سکتیں۔ ہر فرد کے لیے اس لحاظ سے نماز کا ایک الگ معنی بھی ہے۔ دوسری مثال رات کی دی کہ رات کی مختلف نوعیتیں اور اوقات مختلف افراد کے لیے مختلف ہو سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ الفاظ تمام ممکنہ معانی کا کامل احاطہ نہیں کرتے۔ چنانچہ زبان قطعی الدلالت نہیں۔

سوال یہ ہے کہ قطعی الدلالت کے مفہوم میں یہ چیزیں شامل کیوں کر ہو گئیں؟ لفظ کے معنی میں اس معنی سے کسی فرد میں پیدا ہونے والی داخلی کیفیات، لفظ کے مصداقات اور اطلاقات کو شامل کرنا محض غلط اور خلط مبحث پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ لفظ کے متعدد مصداقات اور ان مصداقات کے تنوعات لفظ کے معنی نہیں ہوتے۔ قرائن سے مصداقات کا تعین ہو جاتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو زبان ہی کی راہ سے واضح کیا جا سکتا ہے کہ کون سا مصداق مراد ہے۔ کلام میں ایسے مصداقات کا تعین مقصود نہ ہو تو اس کے درپے ہونا اور نہ ملنے پر کلام ہی کو غیر قطعی مان لینا محض کم عقلی ہے۔ تعیین مصداق کی ضرورت کے باوجود کسی کلام میں ایسے تعینات نہ ہوں تو یہ کلام کا نقص ہے، زبان کا نہیں، جو اسے واضح کر سکتی ہے۔ زبان اور کلام کو ہم عملاً اسی طرح برتتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ فقط احتمالِ نقیض یا برعکس مفہوم ہے جو اگر کسی لفظ کے معنی میں پیدا ہو جائے اور دور نہ کیا جا سکے تو کلام غیر قطعی کہلاتا ہے۔ استاد جاوید احمد غامدی اپنی کتاب ''مقامات'' میں لکھتے ہیں:

''بعض کم سواد یہ سمجھتے ہیں کہ ہر وہ علم جو غور و تفحص سے حاصل کیا جائے یا اُس میں غلطی کا امکان مان لیا جائے، وہ ظنی ہوتا ہے۔ ہرگز نہیں، غور و تفحص سے حاصل ہونے والے علم کو نظری کہا جاتا ہے جو قطعی بھی ہوتا ہے اور ظنی بھی۔ چنانچہ اُس کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ 'ھو الفکر الذی یطلب بہ من قام بہ علمًا أو ظنًا'۔ آمدی نے مزید وضاحت کی ہے کہ 'ھو عام للنظر المتضمن للتصور و التصدیق، والقاطع و الظنی'۔ رہا غلطی کا امکان تو یہ محسوسات اور تجربیات تک میں مانا جا سکتا ہے، اِس لیے کہ انسان جب تک انسان ہے، غلطی سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ ائمۂ اصول کی اصطلاح میں ظنی الدلالہ کی تعبیر اِس کے لیے نہیں، بلکہ اُس کلام کے لیے اختیار کی جاتی ہے جس میں نقیض کا احتمال مان لیا جائے، یعنی تسلیم کر لیا جائے کہ ترجیح بے شک اُسی مفہوم کی ہے جو 'ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ' سے بالعموم سمجھا جاتا ہے، لیکن اِس جملے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ ایک نہیں ہے۔ اِس طرح کا احتمال ہے جو کسی کلام کو ظنی الدلالہ بناتا ہے۔''

(138)

جس طرح وحدت الوجود اور وحدت ادیان کے فلسفے ہر قسم کے متضاد و متناقض نظریات اور اعتقادات کو اپنے اندر سمو لینے کو کوئی کام سمجھتے ہیں اسی طرح کلام میں مفاہیم کی بے جا تکثیریت اور تعیینِ معنی سے گریز کے لسانی فلسفے ہر قسم کی کج فہمی اور انحراف کو انگیز کر لینے کا مطالبہ کرتے اور غلط اور درست اور حق و باطل کے معیارات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ایسا ہر فلسفہ قابل رد ہے جو غیر حقیقی اور خیالی بنیادوں پر کلام الٰہی کو ظنی قرار دے کر حق و باطل میں امتیاز کی راہ مسدود اور تشکیک اور الحاد کی راہ ہموار کرتا ہے۔

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

فواد احمد

نظم قرآن امت کا حبل المتین

[”نقطۂ نظر“ کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

قرآن مجید کا اعجاز قاری پر واضح ہونے کے لیے پہلے اس کا مدعا اور اس کی تاثیر آشکار ہو جانا ناگزیر ہے اور یہ تب ممکن ہو جاتا ہے جب قرآن مجید کے کلام کی ہیئت کی انفرادیت اور اس کلام میں موجود نظم دریافت ہو جائے۔ اس عظیم کلام کی ہیئت اس وقت زیر بحث نہیں ہے جب کہ امام فراہی کے بقول قرآن مجید کا نظم ان اسرار و عجائب کے خزانے کی کلید ہے، جو اس کلام میں موجود ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے مسلمانوں کی پوری علمی روایت میں بیش تر لوگوں نے قرآن مجید کا مدعا متعین کرتے وقت اس میں موجود نظم کو پیش نظر نہیں رکھا۔ امام فراہی کے بقول نظم قرآن اسرار و عجائب کا وہ مدفون خزانہ ہے جس کا بہت کم حصہ اب تک دریافت ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کلام کا مدعا متعین کرنے میں جب اس کی نظم کو نظر انداز کیا گیا اور اس کلام کو متفرق آیات کا مجموعہ سمجھا گیا تو اس کے سبب مسلمانوں کے درمیان غیر ضروری اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد ان مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والوں کے درمیان اختلافات وقت گزرنے کے ساتھ اس قدر شدت اختیار کر گئے کہ ہر نقطۂ نظر رکھنے والوں کی الگ روایت بن گئی اور اس روایت سے جڑے

تعصبات پیدا ہو گئے اور یوں امت فرقوں میں تقسیم در تقسیم ہو گئی، کیونکہ نظم قرآن کی صورت میں ان مختلف مکاتب فکر کے درمیان کوئی معیار نہیں مانا گیا جس کو ان کے درمیان قول فیصل کی حیثیت حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی اپنے ہی فہم کو خدا کا اصل مدعا سمجھ رہا ہے۔ قرآن مجید کا نظم اس کی مختلف تعبیر و تفاسیر کے لیے معیار ہے۔ اسی معیار پر پرکھا جائے گا کہ قرآن مجید کا اصل مدعا کیا ہے۔ جب نظم قرآن پیش نظر رکھا جائے تو مدعا متعین کرنے کے لیے دوسرے ذرائع کی ضرورت باقی نہیں رہتی، بلکہ قرآن مجید اپنا مدعا خود ہی واضح کرتا ہے اور یوں قرآن مجید کسی انسانی فہم کے تابع نہیں ہوتا۔ اختلاف کی صورت میں جب نظم قرآن کی authoritative حیثیت کو نظر انداز کیا گیا تو اس lacuna کو پُر کرنے لیے اجماع اور اس کے بعد اپنے مکتبۂ فکر کی روایت کی صورت میں انسانی فہم کو اتھارٹی دے دی گئی۔ اجماع کو اتنی بڑی حیثیت دے دی گئی کہ یہ قرآن مجید کا فہم متعین کرتا ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ کی رائے میں کسی مجتہد کا پہلا مرجع اجماع ہونا چاہیے۔ یعنی ان کے ہاں مصادر کی ترتیب میں سب سے پہلی حیثیت اجماع کو حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

فینظر أول شی فی الإجماع فان وجد فی المسألة إجماعا ترك النظر فی الکتاب والسنة. (المستصفی 374)	”یعنی مجتہد کو سب سے پہلے کسی حکم کی تلاش کے لیے اجماع کو دیکھنا چاہیے اگر وہاں مسئلے کا حکم مل جاتا ہے تو قرآن مجید اور سنت میں تلاش کرنا چھوڑ دے۔“

اجماع کا اصل تصور ہی تبدیل کر دیا گیا۔ اجماع تو اصل میں جم غفیر (یہاں غور کریں جم غفیر سے مراد فقط علما و فقہا نہیں، بلکہ کسی دور کے عام و خاص لوگ ہیں) کا کسی ”واقعہ“ (یہاں دوبارہ غور کریں کسی واقعے کو نہ کہ کسی فہم) کو اگلی نسل تک منتقل کرنا ہے۔ یہی عمل اس واقعے کی صحت کے لیے سند اور اگلی نسل کے لیے ذریعۂ علم بن جاتا ہے۔ یہ اجماع کا غلط تصور ہے کہ کسی مخصوص دور کے خاص لوگ کسی مخصوص فہم پر متفق ہو جائیں اور پھر اسی مخصوص فہم کو علم قطعی سمجھا جائے۔

یا دور نبوت کے بعد کسی مخصوص دور میں مخصوص لوگوں کے کسی مخصوص فہم پر متفق ہونے

کو قطعی علم سمجھا جائے اور پھر قرآن مجید کو بھی اسی انسانی فہم کے تابع کیا جائے، اور پھر قیامت تک یہی فہم حتمی مانا جائے تو یہ اجماع کا غلط تصور ہے۔ لہٰذا جب نظم قرآن کو پیش نظر رکھا جائے تو قرآن مجید کی تفسیر میں خود قرآن ہی کو مرجع کی حیثیت حاصل ہو گی اور باقی تمام ذرائع علم اس کے تابع ہوں گے۔ امام فراہی بھی اپنی کتاب ''نظام القرآن'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ نظم قرآن کی طرف میری رہنمائی خارج سے نہیں، بلکہ خود قران مجید کے اندر سے ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ نظم قرآن کو نظر انداز کرنے سے ہر فقہی مذہب اپنی الگ الگ مستقل حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور ہمارے پاس وہ معیار یا کسوٹی باقی نہیں رہتی جس کو مختلف فقہی مذاہب کے متعین کیے گئے بنیادی اصولوں کو پرکھنے کیلئے بروے کار لایا جائے۔ لہٰذا ہمارے پاس کوئی common legal theory نہیں ہے جس کو معیار کی حیثیت حاصل ہو، اس کے برعکس ہر فقہی مذہب اپنے الگ اصولوں پر کھڑا ہے اور یہ اصول دوسرے فقہی مذہب سے مختلف ہیں۔ لہٰذا جب ہم نے کسی مخصوص فقہی مذہب کے حکم کی صحت کو دیکھنا ہو تو کسی مخصوص مذہب کے اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور یہ دیکھنا ہو گا کہ ان اصولوں میں مطابقت ہے یا نہیں۔ یعنی ان اصولوں کی صحت کے لیے ان کے درمیان مطابقت ضروری ہے۔ جب کہ کسی فقہی مذہب کے ان اصولوں کی بلاواسطہ اصل مصدر (قرآن مجید) سے validation حاصل کی جائے، اس کا کوئی طریق کار نہیں کیونکہ نظم قرآن کو نظر انداز کر کے ہر ایک نے اپنے فہم کے مطابق اپنے فقہی مذہب کے بنیادی اصول متعین کیے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مختلف مذاہب کے اصولوں کی validation کے لیے کوئی معیار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب کے legislative presumptions کا birds eye view پیش نہیں کیا جا سکتا، بلکہ کسی مخصوص فقہی مذہب کے اندر رہ کر اس کے اصولوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید کو انسانی فہم کے تابع کرنے سے میری مراد قرآن مجید کی تعبیر کے دوران میں سیاق وسباق، موقع و محل، اور مخاطبین (یہ کسی بھی کتاب کو سمجھنے کے فطری اصول ہیں)، سب نظر انداز کر کے کوئی special اصول وضع کرنا ہے (جیسے حدیث سے تشریح کرنا، اجماع کو معتبر ماننا وغیرہ)۔ ایسا کرنے سے ہر مکتبۂ فکر الگ مستقل حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس وہ کسوٹی باقی نہیں رہتی جو ان مختلف مکاتب فکر کے درمیان فیصلہ کن ہو۔

نظم قران کی رعایت کے بعد بھی مختلف مکاتب فکر بنیں گے، لیکن تب ہمارے پاس وہ کسوٹی ہو گی جو اختلاف کے وقت فیصلہ کن ہو۔ ہم یہ کہنے کے قابل ہوں گے کہ یہ متعین اصول ہیں اور ان اصولوں کا یہاں اطلاق نہیں ہوا۔ انسانی فہم کے برعکس نظم قرآن ہی قرآنی فہم ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نظم قرآن ہی حبل المتین ہے۔ امام فراہی ''نظام القرآن'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ تاویل کے بیش تر اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اگر نظم کلام ظاہر ہوتا اور سورہ کا عمود یا مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تاویل میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ ہوتا، بلکہ سب ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے اور سب کے منہ سے ایک ہی صدا بلند ہو جاتی 'کشجرۃ طیبۃ أصلھا ثابت او فرعھا فی السماء'، ''وہ ایک شجرۂ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔''

ہم وہ مے کش ہیں کہ منت کشِ صہبا نہ ہوئے
مانگ لائے ہیں رگِ تاک سے نم اے ساقی

مولانا امین احسن اصلاحی

منصب رسالت سے متعلق چار بنیادی غلط فہمیاں

معرفتِ الٰہی اور حصول تزکیہ کا دوسرا قابل اعتماد ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے صحیح فیض ایک طالبِ تزکیہ اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کو صحیح قسم کی نسبت حاصل ہو، اس نسبت کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کی حیثیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ خاص طور پر یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ عہد صحابہ و تابعین کے گزرنے کے بعد سے اس چیز کے بارہ میں ہمارے درمیان بہت کچھ اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور اس اختلاف کا اثر حصولِ معرفت و تزکیہ کے اس مقصد پر لازماً پڑتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے وابستہ ہے، اس وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے اختصار کے ساتھ نقطہ ہائے نظر کا یہ اختلاف واضح کر دیں۔ اس کے بعد تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہماری کس نوعیت کی وابستگی معرفت الٰہی کے مقصد کے لیے کار آمد ہو سکتی ہے اور یہ وابستگی پیدا کرنے کے لیے ہمیں کن باتوں کا اہتمام کرنا ہے، کس قسم کی جد وجہد عمل میں لانی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کی حیثیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کے بارہ میں ہمارے اندر جو غلط تصورات پیدا ہو چکے ہیں، وہ ہیں تو بہت سے لیکن

ہم ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ ہم صرف چار بنیادی غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کریں گے جو ہمارے چار بڑے بڑے گروہوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

1۔ ہمارے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہی حیثیت سمجھتا ہے جو ایک کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان کسی معتمد ہرکارہ اور ایک دیانت دار چٹھی رساں کی ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام بس یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب اپنے بندوں پر نازل فرمانی چاہی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پہنچا دی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ختم ہو گیا۔ وہ اپنے اسی تصور کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت متعین کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ منصبِ رسالت کا اس قدر حقیر تصور رکھتے ہیں، ان کے لیے معرفتِ الٰہی کے نقطۂ نظر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ کسی غیر معمولی وابستگی کے لیے بھی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ جب اصلی کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف خط پہنچا دینا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خط پہنچا چکے تو اس کے بعد اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ اصل خط کی ہے یا زیادہ سے زیادہ کاتب کی، نہ کہ خط کے لانے والے قاصد کی۔ اس کے بعد تو اگر قاصد سرے سے درمیان سے غائب بھی ہو جائے، جب بھی ان حضرات کے نقطۂ نظر سے کوئی خلا نہیں واقع ہونا چاہیے۔

رسالت کا یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ نبی، خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان صرف ایک قاصد اور نامہ بر ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک معلم بھی ہوتا ہے، ایک مُزکی بھی ہوتا ہے، ایک مرشد بھی ہوتا ہے، ایک سراج منیر بھی ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک واجب الاطاعت ہادی بھی ہوتا ہے اور پھر اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ارشاد و ہدایت کے فرائض کے سلسلہ میں براہ راست خدا کی نگرانی میں ہوتا ہے، جس کے سبب سے وہ غلطی اور گم راہی کے تمام خطروں سے بالکل محفوظ و مامون ہوتا ہے۔ اس کا فریضہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خدا کی کتاب بندوں کو پہنچا دے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ وہ اس کتاب کے تمام اسرار و رموز لوگوں کو سمجھا دے، اس کتاب پر عمل کر کے دکھا دے، اس کتاب پر عمل کرنے والوں کا ایک گروہ اپنی

تعلیم و تربیت سے تیار کر دے اور اس کتاب کے مضمرات، ان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں نمایاں کر دے۔ ان سارے کاموں میں اس کی اپنی ذات ایک عامل کی حیثیت سے بھی شریک ہوتی ہے اور ایک رہنما کی حیثیت سے بھی شریک ہوتی ہے اور اپنی اس دوسری حیثیت میں جو کچھ وہ کہتا ہے یا کرتا ہے یا جس چیز کو وہ منظور کر لیتا ہے، اس کو اس کتاب کے اور اس منصبِ رسالت کے تحت ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی حیثیت سے اس کو قبول کیا جاتا ہے۔

رسالت کے اس تصور کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم جتنی گوناگوں نوعیتوں کے تعلقات رکھتے ہیں اتنی گوناگوں نوعیتوں کے تعلقات نہ دنیا میں ہمارے کسی کے ساتھ ہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔ یہاں آپ سے آپ یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان گوناگوں تعلقات کی نوعیت سے اچھی طرح واقف نہ ہو یا ان میں سے بعض کا یا کُل کا منکر ہو تو وہ ہرگز آپ کی ذات بابرکات سے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی ہے۔

2۔ دوسرا گروہ جو منصب رسالت کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہے وہ ہمارے اربابِ تصوف کا ہے، یہ لوگ اول تو شریعت اور طریقت اور علم ظاہر اور علم باطن کی الگ الگ حد بندیاں قائم کیے ہوئے ہیں۔ پھر مزید یہ ستم کرتے ہیں کہ ان دونوں علموں کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہاں تک علمِ ظاہر یا علمِ شریعت کا تعلق ہے اس کی تعلیم تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو دی، لیکن علم باطن یا علم طریقت کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور ایک راز کے صرف چند مخصوص لوگوں ہی کو بتائی اور پھر انھی لوگوں کے واسطہ سے یہ علم سینہ بہ سینہ تصوف کے مختلف سلسلوں تک منتقل ہوا ہے اور وہی اس راز کے امین بنے۔

اس خیال کے اندر جو خرابیاں ہیں اور اس سے منصب نبوت کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر اس سے معرفت الٰہی کے نصب العین کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کی طرف ہم اس کتاب کی پہلی فصل میں بعض اشارات کر چکے ہیں۔ یہ خیال اگرچہ غلط ہے، لیکن غلط ہونے کے باوجود ہمارے نزدیک کم از کم اس پہلو سے غنیمت ہے کہ اس میں علم ظاہر اور علم باطن، دونوں کا سرچشمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ علمِ شریعت کا سرچشمہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کیا گیا ہو، لیکن علمِ طریقت کا سرچشمہ کسی اور کو قرار دے دیا گیا ہو۔

ورنہ اہل تصوف میں تو ایک ایسا گروہ بھی ہے جو نبوت اور ولایت کے دو الگ الگ بالکل متوازی منصب تسلیم کرتا ہے پھر ان میں سے ایک کو وہ علم ظاہر (یعنی علم شریعت) کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور دوسرے کو علم باطن کا۔ اس گروہ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جس طرح خاتم الانبیا کا منصب مخصوص ہے، اسی طرح بعض اشخاص کے لیے ان کے نزدیک خاتم الاولیا کا منصب مخصوص ہے۔ ان کے نزدیک یہ دونوں منصب بالکل دو متوازی نظاموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دو مستقل نظاموں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ ان کے درمیان رقابت اور کشمکش کی حالت رہے۔ چنانچہ ان کے درمیان بھی برابر رقیبانہ چوٹیں چلتی رہتی ہیں۔ طریقت کے علم بردار شریعت کے حامیوں کو ظاہر پرست اور بے مغز قرار دیتے ہیں اور شریعت کے حامی، طریقت کے حامیوں کو مبتدع اور گم راہ ٹھہراتے ہیں اور اس تعصب اور غلو نے بڑھتے بڑھتے یہ شکل اختیار کر لی ہے کہ بہت سے صوفی حضرات شریعت کو اپنی طریقت کے مقابلے میں پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے اور معرفت الٰہی کے نقطۂ نظر سے ان کی نگاہوں میں جو مرتبہ شیخ محی الدین ابن عربی کا ہے وہ العیاذ باللہ کسی نبی کا بھی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص منصب رسالت کے متعلق سوء ظن میں مبتلا ہو جائے تو اس کو معرفت الٰہی کا ایک ذرہ بھی حاصل نہیں ہو سکتا، اگرچہ وہ بزعم خویش باطن میں اتنا کمال حاصل کر لے کہ ہوا میں اڑنے اور پانی پر دوڑنے لگ جائے۔ معرفت الٰہی کا صلی ذریعہ صرف انبیا علیہم السلام ہی ہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت آخری اور کامل شریعت ہے اس وجہ سے لازماً آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الاولیا اور خاتم العارفین ہیں۔ معرفت کا جو مقام آپ کو حاصل ہوا، وہ نہ کسی اور کو حاصل ہوا اور نہ ہو گا اور علم کا جو خزانہ آپ کی شریعت کے اندر پوشیدہ ہے، وہ خزانہ نہ کسی اور چیز کے اندر ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

3۔ ہمارے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ماضی کی ایک قابل احترام شخصیت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ساری قوم چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول کہتی ہے، اس وجہ سے یہ لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ہی کہتے ہیں اور قومی روایات کے زیر اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حمیت اور عصبیت کا جذبہ بھی ایک حد تک

رکھتے ہیں، لیکن یہ بات ان لوگوں کے دل میں کسی طرح بھی نہیں دھنستی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس معاملہ میں جو کچھ فرما گئے ہیں وہی حرف آخر ہے اور انسان کی دنیوی اور اخروی سعادت کا انحصار بس اس کو بے چون و چرا مان لینے ہی پر ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا اور سکھایا وہ ایک مخصوص زمانہ اور ایک مخصوص ماحول کے لیے تو بے شک ٹھیک تھا، لیکن علم و روشنی کے اس زمانہ میں بھی انھی چیزوں پر اصرار کیے چلے جانا، ان کے خیال میں جہالت اور حماقت ہے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی باتوں میں سے اگر کچھ چیزیں ماننے جانے کے قابل ہیں تو یا تو وہ ہیں جو خود ان کی اپنی خواہشات کے مطابق ہیں یا وہ ہیں جن کو خوش قسمتی سے موجودہ زمانے میں بھی قدر و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو یہ لوگ دل سے گوارا کرنے کے لیے تیار ہوں اگرچہ اپنی کمزوری اور بزدلی کے سبب سے اس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ رکھتے ہوں۔

4۔ ہمارے عوام الناس کا ایک بڑا طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے، جن کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بس ایک اندھی بہری عقیدت کا مرجع ہے، وہ مختلف اوقات میں اپنی اس عقیدت کا اظہار کر کے اپنے خیال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت و رسالت کے تمام حقوق و واجبات سے اپنے آپ کو سبکدوش کر لیتے ہیں، انھیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس مقصد کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو کیا تعلیم دی، اپنے بعد امت پر کیا ذمہ داریاں چھوڑ گئے اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے ہمیں کیا کچھ کرنا ہے، ان سوالوں پر غور کرنے اور ان کے تقاضے پورے کرنے کے بجاے وہ اپنے تصورات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ اظہار عقیدت کر لینے کو کافی سمجھ لیتے ہیں، اگرچہ اس اظہار عقیدت کا طریقہ صریحاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ہدایات کے خلاف ہی ہو۔ جاہل پیروں اور مولویوں کی ایک جماعت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عوام کے جذبۂ عقیدت سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ شریعت کی حقیقی ذمہ داریوں سے محفوظ رہتے ہوئے عوام میں مقبول بننے کا یہ راستہ بہت سہل ہے کہ عوام کی اس جاہلانہ عقیدت کی حوصلہ افزائی کی جائے چنانچہ انھوں نے ایک طرف تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب رسالت سے اٹھا کر خدائی کے منصب پر متمکن کرنے کی کوشش کی، اور اپنے زعم کے مطابق اس کے دلائل

فراہم کیے۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار عقیدت و محبت کے ایسے طریقے ایجاد کیے جن سے ان کو اپنی خواہشات نفس کی تسکین کے لیے شریعت کی تمام پابندیوں سے پوری آزادی مل جائے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور آپ کی محبت و عقیدت کا کلمہ پڑھتے ہوئے ان تمام عقائد کی بنیادیں بھی ڈھا دی گئی ہیں جن سے معرفت الٰہی کی راہیں کھلتی تھیں اور وہ تمام اعمال و اخلاق بھی برباد کر دیے گئے جو اس معرفت کو جلا دینے والے تھے۔ جس ذات کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس مقصد کے لیے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کے لیے رہنما بنے اور ان کو خدا کا راستہ دکھائے، اسی کے نام کو ان ظالموں نے اس مقصد کے لیے استعمال کیا کہ لوگوں کو خدا کے راستہ سے ہٹا کر ان کو گم راہی کے راستوں پر ڈال دیا۔

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(3)

[صاحب تدبر قرآن کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین
کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

مولانا اصلاحی کی تعلیم کا سلسلہ جب سرکاری اسکول سے منقطع ہوا تو انھیں دوسرے مدرسے میں داخل کرایا گیا۔ اس مدرسے کا کیا نام تھا، اور یہ داخلہ کب ہوا، یہ ماضی کے دھندلکوں میں اوجھل ہے۔ مولانا کو بس اتنا یاد ہے کہ یہاں ان کے استاد مولوی فصیح احمد تھے اور وہ انھیں دینیات کی تعلیم دیتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ یہ گاؤں ہی کی مسجد کا مدرسہ رہا ہو گا۔

مولانا کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب وہ مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے۔ امین احسن اس میں 9 جنوری 1915 میں متعلم ہوئے۔ ریکارڈ کے مطابق ان کا اس مدرسے میں

داخلے کا نمبر 328 ہے۔ وہ یہاں درجہ سوم اردو میں طالب علم بنے۔ اس کا مطلب ہے کہ انھوں نے سرکاری اسکول اور مسجد کے مدرسے میں جو تعلیم حاصل کی، اسے ابتدائی دو جماعتیں تصور کیا گیا۔ مولانا اندازے سے فرماتے ہیں کہ ان کی عمر اس وقت دس برس سے کچھ زیادہ تھی۔

امین احسن کے مدرسہ آنے سے ایک برس قبل ہی وہ سال تھا جب مولانا شبلی نعمانی مدرسے کی اصلاح کا بیڑہ اٹھا چکے تھے۔ اور مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا شبلی متکلم کچھ نئے اساتذہ کے ذریعے سے اسے شبلی کے خوابوں کی تعبیر دینے کے لیے عزم بالجزم کر چکے تھے۔

امین احسن بتاتے ہیں:

> ”ایک دن شبلی متکلم ہمارے گھر آئے۔ یہ میرے چچا تھے، حقیقی نہیں، گاؤں کے رشتے سے۔ ان کا خاندان دوسرا تھا اور میرا کوئی اور۔ لیکن گاؤں کا یہ رشتہ بڑا مضبوط ہوتا تھا۔ وہ آئے اور انھوں نے مجھے دیکھا۔ والد سے کہا کہ میں اسے مدرسے میں لے جا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔“

امین احسن کی اس بات سے واضح ہو رہا ہے کہ شبلی متکلم ذہین طلبہ کی تلاش میں رہتے تھے اور گاؤں میں یہ مدرسہ معلوم و معروف تھا۔ اس مدرسے کی نیک شہرت کی ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ کسی فرقے یا خاص مذہبی گروہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا، بلکہ حیرت انگیز طور پر اسے جن صاحب ثروت لوگوں نے جگہ دی اور ابتدائی تعمیر کے لیے سرمایہ فراہم کیا، ان میں اہل تشیع اور اہل سنت دونوں طرح کے لوگ شامل تھے۔ (حیات شبلی 682)

تعلیم کی ابتدائی مشکلات

امین احسن اپنی کلاس میں سب سے کم عمر طالب علم تھے اور ان کے ہم جماعت کس عمر کے تھے، اس کا تذکرہ انھی کے الفاظ میں سنتے ہیں:

> ”میری کلاس میں کالی ڈاڑھی والے لوگ تھے۔ یعنی میری عمر سے بہت بڑے۔ مولوی فصیح احمد بھی تھے پہلے سال تک۔ میں انھیں دیکھ کر بہت حیران ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ تو پچھلے مدرسے میں میرے استاد رہ چکے تھے۔ مجھ سے بڑے مولوی اختر تھے۔ وہ بھی مجھ سے چار برس بڑے تھے۔ لیکن بظاہر ہم ایک جیسے ہی لگتے تھے یہ نہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی ”اسلاف“ کے زمانے کے ہیں۔ وہاں کئی استاد تھے، مولوی عبداللہ، مولوی برکات، مولوی شبلی متکلم۔ یہ

سب استاد بڑے نامی گرامی تھے۔ وہ جو کچھ بھی تھے، ضرور بڑے مرتبے کے ہوں گے، مگر مجھے اپنی مظلومیت پر، اپنے آپ پر بہت ترس آتا تھا۔"

اس کی مولانا متعدد وجوہات بتاتے ہیں۔ مثلاً اپنے ہم جماعتوں کے اتنا بڑے ہونے کا امین احسن کو خاصا نقصان ہوا۔ وہ بتاتے ہیں کہ استاد ان مولویوں کی طرح میرے بارے میں یہی سمجھتے کہ مجھے بھی ابتدائی اسباق ازبر ہیں۔ اور میں بھی ان کی طرح بنیادی قواعد سے اچھی طرح واقف ہوں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس سے میری بنیادی تعلیم میں کمی رہ گئی۔ اسے انھوں نے بعد میں ایک دوسرے شفیق استاد کی مدد سے دور کیا۔ اور اس کی نوبت اس وقت آئی جب مدرسہ میں مولانا حمید الدین فراہی کی اصلاحات نافذ ہوئیں۔ اس کی داستان آگے آرہی ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہوا کہ طلبہ کو اکثریت کے لحاظ سے بعض مضامین ایسے بھی پڑھائے گئے جو گیارہ بارہ برس کے امین احسن کے لیے سخت بے زاری اور غیر دل چسپی کا باعث تھے۔ یہ علم الکلام کا مضمون تھا۔ یہ مضمون مدرسے کے سب سے خاص استاد مولوی شبلی متکلم پڑھاتے تھے۔ اور انھیں اپنے اس مضمون میں مہارت ہی کی وجہ سے "شبلی متکلم" کا نام ملا تھا۔ شبلی نعمانی کو اپنے اس شاگرد پر بہت فخر تھا اور وہ انھیں بطور خاص مدرسۃ الاصلاح کے لیے لائے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ نو آموز طالب علم امین احسن کو عمر کے اس حصے میں علم الکلام سے کوئی دل چسپی ہوئی اور نہ بعد میں۔ وہ اپنے مخصوص اسلوب میں اس کلاس پر تبصرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

"مجھے علم الکلام اور منطق وغیرہ سے بھی وحشت تھی۔ مجھے یہ پڑھائی گئی، لیکن میں نے ایک حرف نہ پڑھ کر دیا۔ اسی طرح مجھے یونانی فلسفے سے بھی پیدایشی نفرت تھی۔ اب مجھے اس سے کیا غرض کہ میں یہ سوچوں کہ بھینس کی دم ہے اور انسان کی نہیں۔ اس حوالے سے بھینس دل میں کیا سوچتی ہو گی؟ اور یہ فلسفہ پڑھانے والے میرے چچا شبلی متکلم ہی ہوتے۔ انھیں فلسفے اور علم الکلام میں مہارت کی وجہ سے متکلم کہا جاتا تھا۔ وہ پڑھاتے ہوئے میرا منہ تکتے اور میں ان کا۔ میں سوچتا کہ بھئی یہ کیا فضول چیز پڑھا رہے ہیں۔ اور وہ خیال کرتے کہ کس قدر بد ذوق اور غبی ہے۔"

تیسری مشکل امین احسن کی یہ تھی کہ وہ چیزوں کو سمجھ کر ذہن کا حصہ بناتے تھے، اس کا فہم حاصل کرتے تھے۔ محض زبانی یاد کرنے سے انھیں بڑی وحشت ہوتی تھی۔ سبق کو رٹنے کے

بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

”مجھ سے پوچھا جاتا تو میں کہتا کہ یاد میں بھی کر سکتا ہوں، لیکن جب میں کسی چیز کو سمجھتا ہی نہیں تو اسے یاد کیوں کروں؟ یہ تو ایک بے کار کام ہے اور بد دیانتی بھی کہ انسان یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ جو بول رہا ہے اسے سمجھتا بھی ہے۔ یہ معلوم رہے کہ میں ہمیشہ سے عاقل انسان رہا ہوں۔ مدرسہ میں میرے ساتھ باقاعدہ ڈاڑھیوں والے لوگ تھے، جو لگتا تھا کہ کئی کئی برس سے وہاں پر پڑے ہوئے تھے۔ اور سمجھنے کے بجاے اسی طرح یاد کرنے ہی کو سیکھنا سمجھتے تھے۔ اور مجھ سے بھی یہ توقع تھی کہ میں بھی گردانیں یاد کروں... اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ شعر یاد کرنا اور بات ہے، لیکن یہ گردانیں! اس سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ میں باقاعدہ گھبرا جاتا۔ اس چیز کا مجھ پر بہت برا اثر ہوا۔“

مدرسۃ الاصلاح کا نصاب اور نظام تعلیم و تربیت

امین احسن جب تیسرے درجے میں داخل ہوئے تو مدرسے کا نصاب پرانی طرز ہی کا تھا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

”شروع میں یہ ایک روایتی مولویوں کا مدرسہ تھا۔ وہی قدوری وغیرہ پڑھائی اور رٹائی جاتی تھی۔ مولانا فراہی اس وقت تک مدرسے کے ساتھ باقاعدہ متعلق نہیں ہوئے تھے۔ ہم جب مدرسے میں آئے تو وہ سرائے میر آچکے تھے اور اپنے گاؤں میں رہتے تھے جو چار میل دور تھا۔ مولانا فراہی روزانہ وہاں آتے تھے۔ پھر انھوں نے مدرسے کو روایتی مولویوں کے چنگل سے نکالا اور نئی شاہ راہ پر ڈالا۔“

نئی شاہ راہ پر ڈالنے کا مطلب اس وقت واضح ہوتا ہے جب ہم ان اصلاحات سے واقف ہوتے ہیں، جو مولانا فراہی نے مدرسے میں کی ہیں۔ ”ذکر فراہی“ میں شرف الدین اصلاحی لکھتے ہیں کہ آغاز میں تو مولانا مسعود احمد ندوی ہی صدرِ مدرسہ تھے، مگر 1916ء میں مولانا فراہی اس کے ناظم بنے۔ اور پھر بلا انقطاع وہ 1930ء، اپنی وفات تک مدرسے کی خدمت کرتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے کیا نصاب نافذ کیا، مدرسے کے اغراض و مقاصد کیا متعین کیے، تعلیم و تربیت کا کیا نظام تھا، مدرسے کے مالی معاملات کیسے چلتے تھے، اس پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ یہ تفصیل بیان کرتے ہوئے واضح رہے کہ ہم ان ضروری نکات تک ہی محدود رہیں گے جس سے

بالا جمال یہ اندازہ ہو جائے کہ مدرسۃ الاصلاح میں روایت کے خلاف وہ کیا اصلاحات نافذ کی گئیں جن کی طرف مولانا اصلاحی نے بطور خاص اشارہ کیا ہے۔

ان تفصیلات کے لیے بجاے اس کے کہ ہم خود کچھ کہیں، مدرسے کی مطبوعہ روداد سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں اور یہ وہ تحریر ہے جو خود مولانا فراہی کی فرمایش سے لکھی گئی اور ان کی نظر سے گزر کر اصلاح پا چکی تھی۔ اور مولانا اصلاحی نے تصدیق کی ہے کہ یہ تحریر خود ان کے قلم سے نکلی تھی۔

مدرسۃ الاصلاح کا منہج

مسلمانوں کی موجودہ پستی جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں طاری ہے، زیادہ تر نتیجہ ہے اس خرابی کا جو ان کی مذہبی تعلیم میں صدیوں سے پیدا ہو گئی ہے۔ جب تک مسلمانوں کی یہ مذہبی تعلیم اپنے صحیح منہج پر قائم رہی وہ برابر دین و دنیا کے تمام شعبوں میں ترقی کرتے رہے۔ لیکن جب سے یہ شاہ راہ کج ہوئی، دینی مدارس اور مذہبی پیشواؤں کی کثرت کے باوجود مسلمانوں کا زوال شروع ہوا اور برابر بڑھتا گیا۔ ان حالات میں خدا نے ایک جماعت کو اپنی توفیق بخشی سے سرفراز کیا اور اس نے یہ طے کر لیا کہ جس اسلوب پر علوم دینیہ کی تعلیم ہو رہی ہے وہ قطعی ناقص اور غیر منتج ہے۔ جب اسلام ہماری دینی اور دنیوی فلاح کا جامع ہے تو اسلامی تعلیم کے یہی معنی ہوں گے کہ وہ نہ صرف ہماری عبادات کا دستور العمل ہو، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ہمارے لیے مشعل ہدایت ہو۔ اب ہمارے درد کا اگر کوئی علاج ہے تو وہ محض رسمی تعلیم اور نصاب مروج کو ختم کرنا نہیں، بلکہ مذہبی تعلیم کو اس کے صحیح معنوں میں جاری کرنا ہے۔ یعنی وہ وسعت و جامعیت جو اسلام کا مفہوم ہے اور تفقہ فی الدین اسی سے عبارت ہے۔ اس جماعت نے اس بلند معیارِ تعلیم کو پیش نظر رکھ کر ایک مدرسے کی بنیاد رکھی جس کا نام مدرسۃ الاصلاح ہے۔

مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کی صراطِ مستقیم کو پا لیا ہے، اس نے اسے اپنا مقصدِ اَساسی قرار دیا ہے۔ وہ مقصدِ اساسی اور صراطِ مستقیم کیا ہے، وہ وہی ہے جس پر آنحضرت نے اپنی امت کو چھوڑا تھا۔ اور جس کی آخری خطبے میں وصیت فرمائی تھی کہ میں تمھارے لیے کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں، جب تک اسے مضبوطی سے پکڑے رہو گے ہر گز گم راہ

نہ ہوگے۔ مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط و تنزل کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ کم کرتے گئے اور وہ علوم جو قرآن مجید کے لیے آلہ اور وسیلہ ہو سکتے تھے، ان کی تحصیل میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ وہ خود مقصود بالذات بن گئے یہاں تک کہ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس و تدریس کے لیے انھوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ محض تلاوت و حفظِ الفاظ پر اکتفا کر لیا گیا اور ہم پر رسولِ خدا کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی:

یارَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا.

یعنی اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو ایک چھوڑی ہوئی چیز سمجھ لیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پالیا اور قرآن مجید کو ہدایت و ترقی تسلیم کر کے جملہ علوم کی تعلیم کو اس کی تعلیم کے ماتحت کر دیا۔ وہ ادب، فقہ، حدیث، تاریخ، سیر، منطق و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن مجید کی روشنی میں اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے۔" (ماہنامہ اصلاح اگست 1936، شذرات، ص 7)

اس مدرسے سے متعلق جو باتیں اصول کی حیثیت سے ان کے بانیان و منتظمین کے سامنے تھیں اور جن کو وہ معاشرے کے سامنے پیش کر چکے تھے۔ وہ بارہا چھپ کر شایع ہو چکی ہیں۔ مدرسے کی مطبوعہ تحریروں سے ذیل میں سے ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ سارے الفاظ مولانا اصلاحی کے ہیں اور ماضی میں اس کی توثیق خود مولانا فراہی کر چکے ہیں۔

1۔ مدرسہ کے اساتذہ و طلبہ غریبانہ اور مذہبی زندگی بسر کریں۔ اساتذہ تنخواہ کے متوقع نہ ہوں۔ کفاف پر قناعت کریں چنانچہ یہاں صدر مدرس، مہتمم 35 روپے ماہوار پاتے ہیں۔ (یاد رہے کہ مولانا فراہی اس زمانے میں دارالعلوم عثمانیہ کے صدر کے طور پر 550 روپے کی خطیر تنخواہ لیتے تھے اور اس کو چھوڑ کر مدرسہ سے 35 روپے کی تنخواہ لے رہے تھے) اور بقیہ اساتذہ بیس بیس، پچیس پچیس روپے ماہوار پاتے تھے۔ یہ بھی اس طرح کہ بعض مرتبہ سال سال بھر ان کی تنخواہوں کا سامان نہیں ہوتا تھا۔

2۔ قرآن مجید کی محققانہ تعلیم اس مدرسے کا نصب العین ہو۔ اس کے بعد حدیث و فقہ پر زور دیا جائے۔ منطق و فلسفہ اور کلام کی غیر ضروری کتابیں نکال دی جائیں۔ ان کی جگہ پر ادب عربی کی

تعلیم دی جائے۔ حدیث شریف کی تعلیم جماعتی عصبیت سے آزاد ہو۔ فقہ میں فقہ اسلامی کی تعلیم دی جائے تاکہ طلبہ میں وسعت نظر اور رواداری پیدا ہو۔ تکفیر و تفسیق کا ولولہ نہ ابھرے۔ صرف و نحو کی تعلیم عملی ہو۔ (یعنی رٹائی نہ جائے) فنون کی تعلیم میں امہات (کتب) پیش نظر رہیں اور لیکچرز کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بقدر ضرورت انگریزی کی تعلیم دی جائے۔ حصول معاش کے لیے صنعت کی تعلیم دی جائے، مدت تعلیم کم سے کم ہو اور نرخ تعلیم انتہائی حد تک ارزاں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم مفت نہ تھی۔

3۔ یہ مدرسہ اہل سنت والجماعت کے مختلف مذاہبِ کا سنگم ہو۔ یہاں حنفی اور اہل حدیث، دونوں ملیں۔ ندوی، دیوبندی، اصلاحی سب تعلیم دیں۔ جزیات کے اختلاف کے باوجود سلف کے طریق پر آپس میں شیر و شکر رہیں۔ اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو مٹادیں۔

(شذرات امین احسن اصلاحی، ماہنامہ الاصلاح اگست 1936، ص8-7)

مدرسے کے تعلیمی مقاصد

خود مولانا امین احسن اصلاحی نے مدرسے کے تعلیمی اہداف کو واضح کرتے ہوئے شرف الدین اصلاحی سے فرمایا:

> ”یہ مدرسہ ایک عظیم فکری انقلاب کا تعلیمی اور دعوتی مرکز تھا۔ اس فکری انقلاب کی روح ہے کہ قرآن کی حکمت اس کے طلبہ کے اندر اس طرح رچ بس جائے کہ وہ جو کچھ بھی سوچیں قرآن کی روشنی میں سوچیں اور جس چیز کو بھی ردو قبول کریں قرآن کی کسوٹی پر رکھ کر قبول یا رد کریں۔ یہ چیز ان کو اس قابل بنائے گی کہ وہ مسلمانوں کی اس پراگندہ بھیڑ کو ایک بنیان مرصوص بنا کر امت مسلمہ کی صورت میں کھڑا کر سکیں۔“ (ذکر فراہی 381)

مدرسے کے لیے مالی وسائل کا حصول

مدرسۃ الاصلاح کی ایک انقلابی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں اس وقت کے مذہبی مدرسوں کے بالکل برعکس اپنا ایک خاص مالی نظام تھا۔ زیادہ تر مذہبی مدرسے اپنے مالی وسائل کے لیے محض چندوں اور صدقات و خیرات کے مرہون منت ہوتے تھے۔ اس مہم میں ان کے اساتذہ اور طلبہ بھی شامل ہوتے، جو ان کی عزت نفس کو بری طرح مجروح کرتی۔ یہ چیز احقاق حق میں بھی بڑی

رکاوٹ بنتی۔ اس زمانے میں عربی مدرسوں کا عام چلن یہی تھا کہ طلبہ بدھ مت کے بھکشوؤں کی طرح گھروں سے کھانا مانگتے۔

یہاں اس امر کا بیان غیر مناسب نہ ہو گا کہ برصغیر میں بھکاری کلچر کو فروغ دینے میں بدھ مت کے بھکشوؤں کا بہت ہاتھ ہے۔ اسی چیز کو بعض مسلمان صوفیوں نے بھی اختیار کر لیا اور یہی روایت مذہبی مدرسوں میں آئی۔ شرف الدین اصلاحی ''ذکر فراہی'' میں لکھتے ہیں کہ مدرسۃ الاصلاح میں اسے شریعت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ بھیک مانگنے کی اس طرح کی کوئی روایت مدرسہ سے وابستہ نہیں تھی۔ سرائے میر میں یہ رواج تھا کہ مدرسوں کے طلبہ بڑے بڑے تھیلے لے کر نکلتے اور لوگ اس میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتے۔ اسے چٹکی بھرنا کہتے۔ یہ واضح طور پر گداگری ہی کی ایک شکل تھی جس سے مدرسۃ الاصلاح بالکل پاک تھا۔ یہ طریقہ ان مدرسوں میں عام طور پر روا رکھا جاتا جہاں غریبوں کے بچوں کو مفت پڑھانے اور رہایش کی پیش کش کی جاتی۔ اور والدین سے اپیل کی جاتی کہ اپنے سات آٹھ بچوں میں سے ایک آدھ کو ''دین کے لیے وقف'' کیا جائے۔ جب کہ مدرسۃ الاصلاح کے اس طرح کے کوئی مقاصد نہیں تھے کہ غربا اور مساکین کے بچوں کی دینی تعلیم کا بندوست کر کے اخروی نجات کا سامان کیا جائے۔ اس لیے عام مدرسوں کے بالکل برعکس یہاں زیر تعلیم بچوں کی اکثریت کھاتے پیتے گھرانوں سے آتی تھی۔ ضلع کے جن شرفا نے مدرسے کے قیام میں حصہ لیا تھا، ان کے اپنے بچے بھی ضرور داخل ہوتے۔ مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے لیے فنڈز مہیا کرنے والوں میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کے صاحب ثروت رشتے داروں کی ایک کثیر تعداد تھی۔

طالب علموں کی اکثریت تعلیم کی فیس اور جملہ اخراجات خود اٹھاتی۔ البتہ جو غریب طلبہ یہ اخراجات برداشت کرنے کی سکت نہ رکھتے ان طلبہ کی مدد کی جاتی، لیکن انھیں اس بات کی بالکل خبر نہ ہوتی کہ وہ مفت یا مدد سے پڑھ رہے ہیں تاکہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ اس لیے مدرسۃ الاصلاح کا ماحول عام مدرسوں سے سو فی صد مختلف تھا۔ (ذکر فراہی 396-395)

اس سب اقدام کے ساتھ ساتھ مولانا حمید الدین فراہی نے مدرسۃ الاصلاح میں مالی وسائل پیدا کرنے کے لیے ایک نیا نظام متعارف کرایا۔ مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا فراہی علما کی گداگرانہ خصلت سے سخت نفرت رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ

مولویوں کے مدرسوں سے بھی گداگری کی لعنت ختم ہو جائے۔ چنانچہ مدرسے کے لیے انھوں نے ایک جائیداد خریدی، جس کا سالانہ منافع آتا ہے۔ اور صرف اپنی کوششوں سے اکثر عربی مدارس کے برخلاف اس مدرسے میں تجارتی اور صنعتی آمدنیوں کے ذرائع پیدا کیے۔ خود اپنی طرف سے اور مدرسہ کے بعض مخلص ہمدردوں کی طرف سے کچھ سرمایہ لگا کر مدرسے میں آٹا پیسنے والی مشین مع انجن لگائی اور اس سے مدرسے کو روزانہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ مدرسے کے اندر جوتا بنانے کا ایک شعبہ قائم کیا جہاں اچھے جوتے پمپ اور شو وغیرہ بنتے۔ وہ (مولانا فراہی) حیدر آباد میں ایک اچھے منصب پر تھے۔ وہاں کے عمائد سے اچھی راہ و رسم تھی۔ مگر اپنے مدرسے کے لیے کبھی ریاست سے امداد کی تحریک نہیں کی۔ فرماتے ہیں کہ بے اطمینانی ہی میں توکل کی دولت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق خاطر کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔''

(یادرفتگاں، سلمان ندوی 151)

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ ریاست حیدر آباد کی ہندستان میں مالی حیثیت کیا تھی۔ یہ تاریخی اعتبار سے مسلمہ بات ہے کہ حیدر آباد دکن اپنے وقت کی برصغیر میں سب سے امیر ترین ریاست تھی۔ اور مولانا حمید الدین ریاست کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے جامعۂ عثمانیہ کے صدر مدرس (پرنسپل) تھے۔ اور ریاست کے اہم لوگ ان کی علمی وجاہت اور بے مثال کردار سے بہت متاثر تھے۔ علامہ اقبال سے لے کر علامہ شبلی نعمانی تک ہندستان کے تمام بڑے لوگ، چاہے ان کا تعلق مذہب سے ہو یا سیاست سے یا ادب سے، ریاست ان کی دل کھول کر مدد کرتی تھی۔ لیکن مولانا حمید الدین نے یہ اصول بنایا کہ وہ مدرسۃ الاصلاح کے لیے کسی بھی قسم کی سرکاری مدد قبول نہیں کریں گے۔ اسی لیے مدرسۃ الاصلاح کی یہ ایک طے شدہ پالیسی تھی کہ وہ سرکار سے کوئی گرانٹ نہیں لے گا۔

واضح رہے کہ مولانا شبلی نعمانی سرکاری چندہ لینے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے اور انھوں نے مدرسۃ الاصلاح کے لیے کوشش بھی کی تھی جو کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ البتہ مولانا فراہی اس کے سخت خلاف تھے اور اسی لیے انھوں نے جب مدرسے کا نظم سنبھالا تو اسے پالیسی کا حصہ بنایا کہ مدرسۃ الاصلاح کسی بھی سرکار سے کوئی مدد نہیں لے گا۔ یہ بات خود مولانا امین احسن نے بیان کی اور اس پر ان کا ''الاصلاح'' کے جولائی 1939 کے شمارے میں لکھا ہوا نوٹ بھی موجود ہے۔

تربیت کا نظام

عام طور پر مذہبی مدارس ہوں یا عام اسکول، تربیت کے حوالے سے بچوں پر تشدد اور مار پیٹ ایک عام چلن ہے۔ لیکن مدرسۃ الاصلاح اس حوالے سے بھی ایک منفرد تعلیمی ادارہ تھا۔ (''تھا'' اس لیے کہ ہم اُس دور کا ذکر کر رہے ہیں اور اسی دور کی خبر ہم تک پہنچی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آج بھی یہ عظیم ادارہ اسی شان دار روایات کا امین ہو گا جس کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں۔ مدرسے کا اگر کوئی طالب علم ہم سے رابطہ کرتا ہے اور آج کے حالات بیان کرتا ہے تو ہم خوشی سے اس کا تذکرہ کریں گے) ''ذکر فراہی'' کے مصنف اور خود مدرسۃ الاصلاح کے طالب علم شرف الدین اصلاحی بیان کرتے ہیں:

> ''مدرسے میں حکم اور ڈنڈے کے زور سے طلبہ کو کسی بات پر مجبور کرنے کے بجائے نصیحت اور تلقین سے کام لیا جاتا ہے اور نصیحت بھی ڈائریکٹ، جس سے ذلت اور انا مجروح ہو، کبھی نہیں کی جاتی۔ بلکہ ان ڈائریکٹ طریقے سے انھیں سمجھایا جاتا ہے۔ جس میں انسان کی عقل سلیم اور فطرت صالحہ سے پہل کی جاتی ہے۔ اس لیے وقفے وقفے سے یا ہفتے میں ایک بار جمع کر کے بالکل غیر رسمی انداز میں ان کو سمجھایا جاتا ہے۔ غلطی اور کوتاہی کسی ایک ہی کی ہوتی ہے، لیکن اس کا نام ظاہر کیے بغیر سب کو مخاطب کر کے سب کو نصیحت کی باتیں کہی جاتی ہیں۔ سوائے اس طالب علم کے کسی دوسرے طالب علم کو معلوم نہیں ہوتا کہ روے سخن کس کی طرف ہے۔'' (ذکر فراہی 395-394)

منفرد ترین تعلیمی نصب العین

ہم یہاں طوالت کے خوف سے مدرسے کا نصاب بیان نہیں کر رہے جو آٹھ برسوں پر محیط ہے، لیکن اس کی وہ خصوصیت ضرور بیان کر دیتے ہیں جو مدرسۃ الاصلاح کا خاص طُرۂ امتیاز ہے۔

یہ مدرسہ کم از کم اپنے اس دور کی وہ پہلی اور واحد درس گاہ تھی جہاں قرآن مجید ''الحمد'' سے ''والناس'' تک مکمل پڑھایا جاتا تھا۔ اور اس کے نصاب میں کوئی تفسیر داخل نہیں۔ حتٰی کہ مولانا فراہی کی تفسیر ''نظام القرآن'' کا کوئی جز بھی شامل نہیں۔

اس بات کی تصدیق خود مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا بدرالدین اصلاحی اور ڈاکٹر شرف

الدین اصلاحی کی تحریروں اور دوسری دستاویزات سے ہوتی ہے۔ اس حوالے سے اسے ایک مسلمہ حقیقت کا درجہ حاصل ہے۔

ذاتی تاثرات

میں یہاں اپنے کچھ تاثرات کو بیان کرنے پر مجبور ہوں۔

جو اغراض و مقاصد ''المورد'' کی تاسیس (1983ء) میں استاد محترم جناب جاوید احمد صاحب غامدی کے پیش نظر تھے۔ اس کا نصاب اور نظامِ تعلیم کم و بیش وہی تھا جو مدرسۃ الاصلاح کا تھا۔ اگر نصاب کی بات کریں تو ہمیں بھی اسباق النحو، کلیلہ و دمنہ، قراۃ الرشیدہ، زمخشری کی المفصل، سبع معلقات وغیرہ کی تعلیم دی گئی اور ''المورد'' کے مقاصد میں یہ شامل ہے کہ قرآن کو مرکز بنا کر علمی و تحقیقی کام اور صحیح الفکر علما و محققین کو تیار کرنا وغیرہ۔

میرے ذہن میں مولانا امین احسن اصلاحی کا وہ صدارتی خطاب گونج رہا ہے جو انھوں نے لاہور کے جناح حال میں دیا تھا۔ اس میں ارباب علم و دانش کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ مولانا اصلاحی بہت برسوں کے بعد کسی پبلک پلیٹ فارم پر خطاب کر رہے تھے۔ (اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔) یہ 1983ء کا سال ہو گا۔ میں اس وقت بالکل مبتدی طالب علم تھا۔ اور ایک تاریخ کو رقم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ مولانا کے سوانح کے لیے جب میری رسائی مدرسۃ الاصلاح کے مجلے ''الاصلاح'' کے شماروں تک ہوئی تو یہ عقدہ کھلا کہ ''المورد'' تو اصل میں مدرسۃ الاصلاح کی تاسیس نو تھا۔ یہ وہی قافلہ تھا جس کا آغاز شبلی نے کیا تھا۔ اور یہ وہی داستان ہے جس کی منزلیں استاد محترم نے اپنی کتاب ''مقامات'' کے ایک مضمون ''قافلہ در قافلہ'' میں بیان کیں۔

امین احسن کیا بننا چاہتے تھے؟

اس ساری تفصیل سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ مولانا اصلاحی کی اس بات کا کیا مطلب تھا کہ مولانا فراہی نے مدرسے کو روایتی فکر سے کیسے آزاد کرایا اور اس کو پٹری پر کیسے چڑھا دیا۔ لیکن مدرسے میں اس قدر منفرد اصلاحات کے باوجود یہ چیز تو موجود تھی کہ یہاں طلبہ والدین ہی کی مرضی سے اپنا مستقبل طے کر کے آتے تھے۔ بلاشبہ اس دور میں ابھی بچوں کی تعلیم کے حوالے سے اتنا شعور عام نہیں ہوا تھا کہ والدین ان کی صلاحیت اور فطری میلان کو مد نظر رکھتے ہوئے ان

کے مستقبل کا فیصلہ کرتے۔ لیکن امین احسن کی حد تک یہ ضرور تھا کہ وہ جو بننا چاہتے تھے، قدرت نے انھیں اسی جگہ پہنچا دیا۔

وہ بتاتے ہیں:

''جب میں مدرسے میں تیسرے برس میں تھا تو ایک مرتبہ مولانا عبدالرحمان نگرامی نے ذہین لڑکوں کو بلا کر پوچھا: تم کیا بننا چاہتے ہو؟ کسی نے کچھ جواب دیا، کسی نے کچھ۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ میں ادیب الہند بننا چاہتا ہوں۔ وہ اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ معلوم ہے کہ ادیب الہند سے کون مراد تھے؟ یہ مولوی فیض الحسن تھے۔ اور اس کے بعد مولانا نگرامی مجھے ادیب الہند کہتے۔''

مولانا فیض الحسن سہارن پوری

امین احسن نے اگر مولانا فیض الحسن سہارن پوری (1887ء-1816ء) کو اپنا آئیڈیل قرار دیا ہے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی شخصیت میں ایسا کیا تھا۔ یہ سوال جب ہم نے مولانا سے کیا تو انھوں نے ایک جملے میں اس کا جواب دیا:

''جب ''ادیب الہند'' کہا جاتا تھا تو اس سے صرف ایک ہی شخصیت مراد ہوتی تھی: مولوی فیض الحسن سہارن پوری۔ وہ استاد اتنے بڑے تھے کہ شبلی اور فراہی، دونوں نے ان کی شاگردی اختیار کی اور کیسے کی، یہ معلوم ہونا چاہیے آپ کو!''

یہ اجمال قدرے تفصیل کا تقاضا کرتا ہے۔ فیض الحسن ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ بڑے پہلوان، ماہر جنگجو، طبیب، شاعر، استاد اور ادیب۔ پہلے پہل طبیعت پہلوانی کی طرف مائل تھی۔ پتنگ بازی کا بھی شوق رہا۔ پھر علم سے ایسی محبت ہوئی کہ عربی اور فارسی میں مہارت حاصل کی اور رام پور، دہلی اور لکھنؤ کے مختلف مدارس اور اساتذہ سے تعلیم پائی۔ 1848ء میں محض تیس برس کی عمر میں سر سید احمد خاں کو مناجات حریری کے کچھ حصے پڑھائے۔ شاعری میں مولوی امام بخش صہبائی سے استفادہ کیا۔ شیفتہ، غالب، مومن اور ذوق کی صحبت پائی۔ شاہی طبیب حکیم امام دین سے طب سیکھی۔

اسی دوران میں 1857ء کی جنگ ہوئی تو آبائی علاقے سہارن پور روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ

ایک پورا قافلہ تھا۔ یہ سب لوگ ان کے زورِ بازو کے بھروسے ان کے ساتھ تھے۔ وہ اتنے طاقت ور تھے کہ ہاتھ سے لوہے کی زنجیر توڑ دیتے تھے۔ تلوار اس مہارت سے چلاتے کہ صرف نیام ہی سے نکالنے کی نوبت آتی اور مخالف مرعوب ہو جاتا۔ سہارن پور میں مطب کھولا، مگر مطمئن نہ ہوئے اور علی گڑھ چلے گئے۔ یہاں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ تراجم بھی کیے، مگر ابھی منزل نہیں آئی تھی۔ انگریز ڈاکٹر لائیٹنز ان کی مہارت سے بہت متاثر ہوئے۔ اور انھیں لاہور آنے کی دعوت دی۔ پھر اکتوبر 1870 میں اورینٹل کالج لاہور کے آغاز ہی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اپنی لیاقت کی وجہ سے ترقی کر کے صدر مدرس ہو گئے۔ باقی زندگی وہیں گزاری۔ یہاں ایک زمانہ ان کا معترف ہو گیا۔ متعدد کتب لکھیں۔ سبع معلقات کی اردو، فارسی اور عربی میں شرح ”ریاض الفیض“ کے نام سے لکھی۔ حماسہ کی بھی شرح لکھی۔ دیوان فیض عربی اور دیوان نسیم فیض فارسی میں مجموعۂ کلام ہے۔ ان کی سترہ سے زیادہ انتہائی وقیع علمی تصانیف ہیں۔ مشہور ہے کہ برصغیر میں حماسہ کا سب سے پہلے درس انھوں نے ہی دیا۔

ان کی غیر معمولی شہرت ہی کی وجہ سے پہلے مولانا شبلی نعمانی اور پھر امام حمید الدین فراہی ان کے شاگرد ہوئے۔ شبلی کی شاگردی کا قصہ ان کے شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے بیان کیا اور امام فراہی کا ان کے شاگرد مولانا اصلاحی نے۔

سید سلیمان ندوی کے بیان کا خلاصہ ہے کہ شبلی نے ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود لاہور کا سفر کیا۔ مولانا فیض الحسن کی رہایش بھاٹی دروازے کے آس پاس تھی۔ انھوں نے وہیں ایک روپیہ کرائے پر ایک کمرے میں ڈیرے ڈالے، آٹھ آنے مہینا بھر کے کھانے کے لیے ایک نان بائی کی خدمات لیں اور مولانا فیض الحسن کا جا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ بھاٹی گیٹ میں بازار حکیماں میں فروکش تھے۔ وہ اس وقت صدر مدرس نہیں ہوئے تھے، اس لیے کہا کہ کالج کے اوقات میں تو کچھ نہیں پڑھا سکتا اور بعد کا وقت بھی دوسروں کے لیے مختص ہے۔ آپ کا شوق بھی قابل التفات ہے، اس لیے گھر سے کالج جانے اور واپسی کے دوران میں سواری میں بیٹھے بیٹھے جو وقت ہے، اس میں درس ہو سکتا ہے۔ شبلی کو علم سے غرض تھی اور بس، فوراً مان گئے۔ اسی دوران میں جب کالج سے چھٹیاں ہوئیں اور مولانا فیض الحسن گھر لوٹے تو شبلی بھی ساتھ ہو لیے۔ اس ساری تفصیل کو انھوں نے اس خط میں تحریر فرمایا ہے جو انھوں نے اپنی والدہ ماجدہ کو فارسی میں لکھا ہے۔ مولانا سلیمان ندوی کے

مطابق عربی شاعری کا صحیح مذاق اور قرآن کی زبان کی نزاکتیں شبلی پر مولانا فیض الحسن ہی کی شاگردی میں آشکار ہوئیں۔(حیات شبلی 84)

مولانا فراہی نے ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کے مطابق 1883ء کے آس پاس لاہور کا سفر کیا۔(ذکر فراہی 91) اور مولانا اصلاحی خود فرماتے ہیں کہ یہ سفر مولانا فراہی نے مولانا فیض الحسن سے عربی ادب ہی کے لیے کیا تھا۔ انھوں اس علم کے رموز انھی سے سیکھے۔ مولانا اصلاحی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا فیض الحسن نے انھیں بھی اسی طرح وقت دیا جس طرح شبلی کو گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک سواری میں دیا تھا۔ لیکن ان کا شوق اور لیاقت دیکھ کر جلد ہی ان کو اس کے علاوہ بھی باقاعدہ وقت دیا۔ اور مولانا فراہی نے علوم ادب کی ان سے باقاعدہ تکمیل کی۔(مجموعۂ تفسیر فراہی 24، نیز مولانا کی زبانی روایت)

ایک اہم نکتہ

یہاں ایک اور حقیقت سامنے رہنی چاہیے۔ امین احسن چودہ یا پندرہ برس کی عمر میں فیض الحسن سہارن پوری کو اپنا آئیڈیل قرار دیتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ ایک خالص علمی شخصیت ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی سیاسی، فوجی یا فنون لطیفہ کی شخصیت اس قابل نہیں تھی کہ ان کا آدرش بن سکے۔ پھر فیض الحسن سہارن پوری کی زندگی ہمیں بتاتی ہے کہ انھیں انگریزی حکومت یا ہندو مسلم مناقشے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ حالانکہ ان کے اساتذہ اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے انگریز کے خلاف جدوجہد کرنے کی پاداش میں جزائر انڈمان میں کالے پانی کی سزائیں کاٹی تھیں۔

مولانا فیض الحسن کو ہم عوام کا نمایندہ بھی قرار نہیں دے سکتے۔ البتہ وہ اپنے زمانے کے انتہائی باشعور انسان تھے، لیکن انھیں معاشرے میں کوئی ایسی خرابی نظر نہیں آئی کہ ان کا علم و عرفان یا دینی ذمہ داری یا حمیت نے انھیں مجبور کیا ہو کہ وہ 1857ء کے ملک گیر ہنگامے کے بعد کوئی اور سرگرمی اختیار کریں۔ ان کے نزدیک ہندستان میں انگریزی حکومت سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اور نٹیل کالج انگریز سرکار کے تحت چلتا تھا اور اس کی ملازمت کرنے کے باوجود ان کے ایمان و اخلاص کو گزند پہنچنے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ ان تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں معلوم

ہوتا ہے کہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری امین احسن کے آئیڈیل تھے۔

سب سے پسندیدہ استاد

امین احسن کو مدرسے میں مولانا عبدالرحمان نگرامی سے زیادہ کسی نے متاثر نہیں کیا۔ اپنے اس پسندیدہ استاد کے بارے میں کہتے ہیں:

''مولانا شبلی نعمانی اچھے مدرسین کی تلاش میں رہتے۔ انھیں ایسا استاد درکار تھا جو صلاحیت کے اعتبار سے بے مثل ہو، لیکن دستیاب محدود وسائل کی بنا پر قوت لایموت کی طرح زندگی گزارنے پر راضی ہو جائے اور وہ انھیں آخر مل گیا۔ یہ تھے مولانا عبدالرحمان نگرامی۔ ندوے کے فارغ التحصیل۔ نوجوان، خوش شکل۔ مولانا شبلی نے انھیں لا بٹھایا۔ وہ آئے تو سارے مدرسے میں ہلچل مچ گئی۔ وہ واقعی عبقری آدمی تھے۔ ذہین، خطیب، ادیب، شاعر، متکلم، فلسفی سب کچھ۔ طلبہ نے ان کا نام ہر فن مولا رکھ دیا۔ ان کی ذہانت کی گواہی مولانا فراہی نے بھی دی۔ انھوں نے کبھی کسی کی تعریف نہیں کی، لیکن ان کے بارے میں بھرے مجمعے میں کہا کہ مولوی عبدالرحمان بہت ذہین آدمی ہیں۔''

''میں جو مدرسے سے مایوس ہو چکا تھا کہ یہ گردان یاد کر کے اور مختلف چیزوں کی الٹی سیدھی تاویلات کر کے کیا حاصل ہو گا۔ ان کے آنے سے ایک لہر پیدا ہوئی کہ نہیں دین کی تعلیم بھی حاصل کر کے باوقار زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ علمی چیزوں کو یاد کرنے کے بجاے سمجھا جا سکتا ہے۔ قوم کی خدمت کی جا سکتی ہے، مولانا نگرامی اردو، عربی اور فارسی، تینوں زبانوں کے خطیب تھے۔''

''میں ان کا لطیفہ آپ کو سناتا ہوں؛ یہ اس دور کی بات ہے جب میں ابھی مدرسے میں داخل نہیں ہوا تھا اور مولانا نگرامی کے حوالے سے یہ واقعہ زبان زد عام تھا۔ ایک مباحثے کا مقابلہ ہوا۔ اور یہ مقابلہ مدرسۃ الاصلاح کے طلبہ کے درمیان نہیں، بلکہ کوئی جلسہ تھا جس میں یہ مقابلہ منعقد ہوا تھا۔ شرط تھی کہ اردو ہی میں نہیں، بلکہ یہ تقریر عربی اور فارسی میں بھی ہو گی۔ اس مجلس میں وہ بھی آکر بیٹھ گئے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے بھی تقریر کرنی ہے۔ صدر مجلس نے اجازت دے دی۔ انھوں اردو میں تقریر شروع کی، پھر فارسی میں، پھر عربی میں، پھر

انگلش میں شروع کر دی۔ اس مجلس میں مولانا شبلی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا: جناب صدر، مولوی عبد الرحمان کو تقریر سے روک دیا جائے۔ ورنہ وہ فرانسیسی میں بھی تقریر کرنے والے ہیں اور اس کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔"

"ان کی مجھ پر خاص نظر تھی۔ میں نے ایک موقع پر کہا کہ میری نحو وغیرہ کم زور ہے۔ پہلے تو انھوں نے باور نہیں کیا کہ میری کوئی چیز خراب بھی ہو سکتی ہے۔ انھوں نے کچھ گفتگو کرنے کے بعد مجھے تسلی دی اور غور کرنے لگے کہ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔ ایک روز وہ میرے لیے ایک کتاب لائے۔ یہ کتاب فارسی میں تھی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ اس میں عربی زبان کی نحو کے تمام مسائل کا حل تھا۔ انھوں نے مجھے اس کتاب کو اچھی طرح پڑھنے کے لیے کہا۔ میں نے بھی اس پر خوب محنت کی۔ اس نے میرے تمام مسائل حل کر دیے۔ میرا اعتماد بحال کر دیا۔ اب میں بڑے سے بڑے نحوی سے مقابلہ کر سکتا تھا، بلکہ اس کے چھکے چھڑا سکتا تھا۔ اس سے سب لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ جس چیز کو میری کمی کہتے تھے اور جس کی وجہ سے مجھ پر رعب جماتے تھے، وہ کمی دور ہو گئی ہے۔ اب یوں میں مولانا نگرامی کی نگرانی میں "علامہ" بن گیا۔ میں واقعی ایک اچھا طالب علم بن گیا۔"

[باقی]

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

ندیم

خوشا یہ وقت کہ پھولوں نے پیرہن بدلا
چمن میں ماہ سے اتری ہے رات کی مہماں
مری نگاہ کتابوں کے ڈھیر سے اٹھی
کہ اس ہجومِ خموشاں میں کچھ نہیں پنہاں

مرے ندیم، کئی بار آخرِ شب میں
مرے چراغ کی لو میں بنی تری تصویر
کنارِ آب چناروں میں ڈوب کر ابھری
خیالِ خواب میں خوابِ خیال کی تعبیر

ندیمِ شوق، اِدھر نو برس سے شام و سحر
رہِ حیات میں کانٹوں کی جستجو میں ہوں

یہ وہ سفر ہے کہ تو اِس سے بے خبر تو نہیں
ترے سوا میں زمانے میں کس سے عرض کروں

یہ دور اہلِ محبت کو سازگار نہیں
ترا خیال بھی اب تو وفا شعار نہیں

سید منظور الحسن

گالی کا جواب

[مسند احمد کی روایت، رقم 9622 سے ماخوذ]

بیاں ہے یہ مسند میں قصہ تمام
کہ بزمِ پیمبرؐ سجی ایک شام
صحابہ تھے مجلس میں حاضر سبھی
نمایاں تھا سب میں رفیقِ نبی
اچانک کھڑا ہو گیا ایک شخص
صحابہ کی جانب مڑا ایک شخص
مخاطب ہوا وہ ابوبکر سے
جھگڑنے لگا پیکرِ صبر سے
پیمبرؐ کی مجلس میں وہ بدزباں
لگا دینے بوبکر کو گالیاں
یہ سن کر نبیؐ کا رفیقِ سفر
گلستانِ امت کا پہلا شجر

سراپا متانت تھا، خاموش تھا
نہ غصے میں تھا اور نہ پُرجوش تھا
ابوبکر دامن بچاتے رہے
نبیؐ دیکھ کر مسکراتے رہے
بہت دیر تک بھی وہ جب نہ ٹلا
تو صدیقِ اکبر کو طیش آ گیا
اُنھوں نے بھی غصے کو ظاہر کیا
جواب اُس کی تلخی کا کچھ دے دیا
پیمبرؐ جو پہلے تو مسرور تھے
اچانک فسردہ و نالاں ہوئے
نبیؐ جب فسردہ و نالاں ہوئے
ابوبکر بے حد پریشاں ہوئے
ابوبکر نے پھر بصد احترام
پیمبرؐ سے پوچھا یہ بعد از سلام
بھلا مجھ سے سرزد ہوئی کیا خطا
کہ ناخوش ہیں مجھ سے رسولِ خدا؟
میں خاموش تھا، آپ مسرور تھے
میں بولا تو رنجیدہ خاطر ہوئے!
ابوبکر کی سن کے یہ التجا
نبیؐ نے بڑے پیار سے یہ کہا:
تو خاموش جب تک رہا میرے دوست!
فرشتہ ترے ساتھ تھا میرے دوست!
وہ تیرے لیے تھا سراپا سلام
اور اُس کے لیے تھا سزا کا پیام

مگر جب دیا تو نے اُس کو جواب
تو رخصت ہوا سب سلام و ثواب
دعاؤں کا پھر سلسلہ رک گیا
مناجاتِ دل کا شجر جھک گیا
ہوئے سن کے بوبکر بے حد ملول
کیا اپنی لغزش کو دل سے قبول
کہا بہ حضورِ رسالت مآب
نہ دوں گا کبھی گالیوں کا جواب
سدا صبر و برداشت دکھلاؤں گا
نبیؐ کا میں اخلاق اپناؤں گا

شاہد محمود

خبر نامہ ”المورد امریکہ“

[اکتوبر 2023]

غامدی صاحب کا دورۂ آسٹریلیا

گذشتہ ماہ جناب جاوید احمد غامدی اور حسن الیاس صاحب مختلف ممالک کا دعوتی دورہ کرنے کے بعد آسٹریلیا پہنچے۔ آسٹریلیا میں ان کا قیام دس دن رہا۔ ”المورد آسٹریلیا“ کے روح رواں ڈاکٹر ذوالفقار نے سڈنی کے اندر تین روزہ ورکشاپ اور ایک پبلک ایونٹ کا اہتمام کیا۔ گذشتہ برس حسن الیاس صاحب نے آسٹریلیا میں ”ذریت ابراہیم عہد بہ عہد“ کے عنوان سے جو سیریز کی تھی، یہ ورکشاپ اسی کا تسلسل تھی۔ اس ورکشاپ میں آسٹریلیا بھر سے لوگوں نے شرکت کی اور جناب جاوید احمد غامدی کے لیکچرز سے علمی استفادہ کیا۔

سڈنی کے بعد غامدی صاحب اور حسن الیاس صاحب نے آسٹریلیا کے شہر Brisbane میں ایک تقریب میں شرکت کی۔ اس تقریب کا اہتمام ارم صاحبہ، احتشام صاحب اور زبیر صاحب نے کیا تھا۔ اس تقریب میں لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس کے بعد جناب جاوید احمد غامدی اور حسن الیاس صاحب آسٹریلیا کے شہر گولڈ کوسٹ چلے گئے۔ غامدی صاحب کا دورۂ آسٹریلیا مجموعی طور پر انتہائی کامیاب دورہ تھا۔

غامدی صاحب کا دورۂ سنگاپور

آسٹریلیا میں دس روزہ قیام کے بعد جاوید احمد غامدی صاحب اور حسن الیاس صاحب سنگاپور کے لیے روانہ ہو گئے۔ سنگاپور میں غامدی سینٹر کے دعوتی مشن کی انفرادیت یہ ہے کہ اس مشن کی باگ ڈور خواتین نے سنبھالی ہوئی ہے۔ یہاں پر غامدی صاحب نے دو علمی اور دعوتی مجالس میں شرکت کی، جن کا اہتمام غزل صاحبہ اور وجیہہ صاحبہ نے کیا۔ ان مجالس میں ''المورد امریکہ'' کے ریسرچ اسکالر اور ماہنامہ ''اشراق امریکہ'' کے مدیر سید منظور الحسن بھی ملایشیا سے شریک ہوئے۔ ایک خصوصی نشست کا بھی اہتمام کیا گیا، جس میں صرف خواتین نے شرکت کی اور غامدی صاحب سے علمی استفادے کے ساتھ ساتھ اپنے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف سوالات کے جواب حاصل کیے۔

غامدی صاحب کا دورۂ ملایشیا

سنگاپور کے بعد جناب جاوید احمد غامدی اور حسن الیاس صاحب ملایشیا پہنچے۔ ملایشیا میں جاوید احمد غامدی صاحب سے اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی کے طلبہ اور دینی پس منظر رکھنے والوں لوگوں نے ملاقات کی۔ ملاقات کے آخر میں حاضرین نے غامدی صاحب سے کچھ نصیحتیں کرنے کی درخواست کی جس کے جواب میں غامدی صاحب نے کہا کہ علم کے سچے طالب بنیں، اپنے اندر حق کی حمیت پیدا کریں اور علم کی زبان کو اختیار کریں۔

قرآن و حدیث کا ہفتہ وار درس

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جناب جاوید احمد غامدی کے لائیو درسِ قرآن و حدیث کا سلسلہ جاری ہے۔ اکتوبر کے مہینے میں 8 نشستوں کا انعقاد ہوا۔ غامدی صاحب نے ان نشستوں میں سورۂ نحل (16) کی آیات 91 تا 95 کا درس دیا۔ درسِ حدیث میں ''قبروں کی پرستش''، ''صراط مستقیم کی مثال''، ''جنت کی حور'' اور ''نیکی اور بدی کیا ہے؟'' جیسے اہم موضوعات زیر بحث آئے۔ قرآن و حدیث کا یہ درس غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''مطالعۂ سیرت'' کی آڈیو ریکارڈنگ

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ کی یہ خواہش تھی کہ ''دبستان شبلی'' اور دوسرے مکاتب فکر

کے اکابر علما کی کتب کو آڈیو کی صورت میں مہیا کیا جائے تاکہ اردو رسم الخط سے ناواقف لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان علما کے کام اور فکری اور علمی افکار سے مستفید ہو سکے۔ اس کام کے لیے جدید سہولتوں سے آراستہ ایک آڈیو سیٹ اپ قائم کیا گیا جس کی ابتدا ڈاکٹر خالد ظہیر نے مولانا وحید الدین خان کی کتاب ''مطالعۂ سیرت'' کی آڈیو ریکارڈنگ سے کر دی ہے۔ گذشتہ ماہ خالد ظہیر صاحب نے اس کتاب کی دو اپی سوڈ ریکارڈ کرائیں جو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر سنی جا سکتی ہیں۔

فکر غامدی پر ایک تنقید کا جواب

ادب، تصوف اور فلسفے کی معروف شخصیت جناب احمد جاوید کی طرف سے جناب جاوید احمد غامدی کے تصورِ نظم قرآن پر تنقیدی لیکچرز نشر کیے گئے۔ اِن میں انھوں نے بیان کیا کہ غامدی صاحب کے تصورِ نظم قرآن نے دین کی ایک منفرد اور مختلف تعبیر کو وجود بخشا ہے، اس کے نتیجے میں علماے دین کی مستند مقبول روایت ناقابل اعتبار ٹھہری ہے۔ ان کے نزدیک یہ تعبیر مغربی اقوام کے نظریات کے زیر اثر ہے۔ منظور الحسن صاحب نے اس تنقید کا مفصل جواب لکھا ہے۔ انھوں نے پہلے احمد جاوید صاحب کے تنقیدی نکات کو بیان کیا ہے اور پھر ایک ایک کر کے ان کا جواب دیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے غامدی صاحب کے تصورِ نظم قرآن کی تشریح بھی کی ہے۔ یہ مضمون ''اشراق امریکہ'' کے اکتوبر 2023 کے شمارے میں ملاحظہ جا سکتا ہے۔

''انسان کو آزمایش میں کیوں ڈالا گیا؟''

یہ محمد حسن الیاس صاحب کا مضمون ہے، جو ''اشراق امریکہ'' کے اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انسانی ذہنوں میں اٹھنے والے سوال کہ ''انسان کو آزمایش میں کیوں ڈالا گیا؟'' اور اہل مذہب کی طرف سے اس کے دیے گئے جوابات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جناب حسن الیاس نے اہل مذہب کی طرف سے اس سوال کے دیے جانے والے جوابات کو غیر تسلی بخش قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ انسان کی آزمایش کے حوالے سے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کے صحیح جواب نہ ملنے کی وجہ سے لوگ مذہب بیزاری کا شکار ہوتے اور کائنات کو خدا کے منصب پر فائز کر دیتے ہیں۔

''البیان'' ترجمۂ قرآن کی آڈیو بک

غامدی سینٹر نے تذکیر بالقرآن پراجیکٹ کے تحت پہلی بار قرآن مجید کو ایک سال میں سنانے کا اہتمام کیا ہے۔ جاوید احمد غامدی صاحب کے ترجمۂ قرآن کو شاہ نواز صاحب نے اپنی دل کش آواز میں ریکارڈ کرایا ہے، جب کہ قرآن مجید کی تلاوت مشاری راشد العفاسی کی آواز میں ہے۔ آواز کے ساتھ ساتھ ناظرین اسکرین پر قرآن مجید کا متن اور ترجمہ بھی دیکھ سکیں گے۔ ہر ہفتے اس کی ایک قسط غامدی سینٹر کے یوٹیوب پر نشر کی جائے گی۔ اس کی پہلی قسط گذشتہ ماہ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر نشر ہوئی ہے جس کو ہزاروں لوگوں نے پسند کیا ہے۔

''حدیث کیا ہے؟'' کے موضوع پر چار مزید نشستیں

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں ''حدیث کیا ہے؟'' کا موضوع زیر بحث ہے۔ ماہ اکتوبر میں اس موضوع کی چار نشستیں نشر ہوئیں۔ ان نشستوں میں حدیث کو سمجھنے کے اصولوں اور انھیں قبول یا رد کرنے کے طریقوں پر بات ہوئی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

''حیاتِ امین'' کی آڈیو بک

''حیات امین'' مولانا امین احسن اصلاحی کی سوانح حیات ہے، جسے غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ کے ریسرچ اسکالر نعیم احمد بلوچ صاحب تحریر کر رہے ہیں۔ غامدی سینٹر نے اس سوانح کو آڈیو کی شکل میں پیش کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ اس کام کے لیے نہایت دل کش اور جان دار آواز کے مالک جناب خالد سید صاحب کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کی تین اقساط ریکارڈ ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر خالد ظہیر کا پروگرام

ڈاکٹر خالد ظہیر نے غامدی سینٹر کے زیر اہتمام کینیڈا سے سوال و جواب کے ہفتہ وار پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ اس پروگرام کے میزبان ملک فیصل اسلم صاحب لوگوں کی طرف سے بھیجے گئے سوالات ڈاکٹر خالد ظہیر کے سامنے رکھتے ہیں اور خالد ظہیر صاحب قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے جوابات دیتے ہیں۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

''قرآن ہم سے کیا چاہتا ہے؟''

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ کے ریسرچ اسکالر منظور الحسن صاحب کا ''رازِ حیات'' کے عنوان سے پروگرام کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ پروگرام ہمارے یوٹیوب چینل سے نشر ہوتا ہے۔ اِس میں مختصر طور پر اور عام فہم انداز میں بات کو سمجھایا جاتا ہے۔ گذشتہ ماہ جو اپی سوڈ نشر ہوئے ان میں سے ایک اہم عنوان یہ ہے کہ ''قرآن ہم سے کیا چاہتا ہے؟'' اس گفتگو میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ قرآن کا ہم سے مطالبہ دنیا کی بہتری ہے یا آخرت کی؟ ''رازِ حیات'' کے پروگرامز غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

''تنقید کو کیسے پڑھا جائے؟''

جناب حسن الیاس کی یہ گفتگو اینی میشن کی صورت میں غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر پیش کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ غامدی صاحب کے پڑھنے اور سننے والے افراد کو ان کی فکری تنقید کیسے پڑھنی چاہیے اور کسی تنقید کو پڑھتے ہوئے انسان کی راہ میں کون کون سی چیزیں حائل ہوتی ہیں۔

''البیان'' اور ''میزان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

شہزاد سلیم صاحب نے پچھلے کچھ عرصے سے غامدی صاحب کی تفسیرِ قرآن ''البیان'' اور اسلام پر ان کی کتاب ''میزان'' کی انگریزی زبان میں تدریس کا سلسلہ جاری کیا ہوا ہے۔ پچھلے ماہ ''البیان'' کی 5 نشستوں کا انعقاد ہوا، جن میں سورۂ بقرہ کی آیات 122 تا 162 زیر بحث آئیں۔ ''میزان'' سیریز کے تحت ''The Economic Shariah'' کے عنوان سے ڈاکٹر شہزاد سلیم نے تین لیکچرز ریکارڈ کیے۔ یہ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

مولانا اصلاحی کے دادا انھیں کیا بنانا چاہتے تھے

''حیات امین'' کی دوسری قسط اکتوبر 2023 کے اشراق میں شائع ہوئی۔ ''حیات امین'' مولانا امین احسن اصلاحی کی سوانح حیات ہے، جسے غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ کے ریسرچ اسکالر نعیم احمد بلوچ صاحب تحریر کر رہے ہیں۔ اِس قسط میں مصنف نے مولانا امین احسن اصلاحی کی

بچپن کی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی کے دادا ان کو کلرک کی قسم کا بابو بنانا چاہتے تھے، جب کہ مولانا کو کلرک بننا پسند نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے گھر اور ارد گرد کے ماحول میں اہل علم کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور وہ خود بھی ان کو پسند کرتے تھے۔ مزید برآں مولانا اصلاحی کی زبانی مدرسۃ الاصلاح کے قیام کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اس مدرسے کے لیے مولانا شبلی نعمانی کی کاوشوں اور خدمات اور ان کے سرسید سے نظریاتی اختلافات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

"اشراق امریکہ" کے انگریزی ورژن کا اجرا

"اشراق امریکہ" کے انگریزی ورژن کا پہلا شمارہ اکتوبر میں شائع ہو گیا ہے۔ اس کی ادارت کے فرائض جناب عابد محمود سنبھال رہے ہیں جب کہ محمد حسن الیاس صاحب اس کے creative administrative ہیں۔ اس کی مجلس ادارت میں جناب اعجاز الحق، جناب محمود الرشید، جناب مالک الٰہی اور جناب محمد عمار ملک شامل ہیں۔ "اشراق امریکہ" کے انگریزی ورژن کو قارئین نے بہت سراہا ہے۔

یونس قاسمی صاحب کا غامدی سینٹر کا دورہ

گذشتہ ماہ پاکستان کے معروف نوجوان عالم محمد یونس قاسمی صاحب نے غامدی سینٹر کا دورہ کیا۔ ان کی تحقیقات کا موضوع ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی علمی اور فکری خدمات کا تعارف ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے حوالے سے کچھ چیزیں غامدی سینٹر کے اسٹوڈیو میں ریکارڈ کرائیں، جو جلد ہی غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہوں گی۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم کے مختلف لیکچرز کی ریکارڈنگ

اکتوبر 2023 میں شہزاد سلیم صاحب نے "اسلامی سزائیں" اور "اسلامی سزاؤں کے بارے میں غلط فہمی" کے عنوان سے دو لیکچر ریکارڈ کرائے۔ Lessons of Life Series کے زیر عنوان 8 لیکچرز ریکارڈ ہوئے۔ ان کے موضوعات یہ ہیں: "خالی وقت خالی دماغ کی طرف لے جاتا ہے"، "پگھلنے والے دل"، "خود احتسابی"، "غصہ کو قابو کرنا"، "زبان کو قابو کرنا"، "کیا ہم مرنے کے

لیے تیار ہیں؟''، ''دو سخت آزمایشیں'' اور ''اپنے اندرونی ٹیلنٹ کو دریافت کرنا'' یہ لیکچر انگریزی زبان میں ہیں اور غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

''جبری تعلیم''

اس مضمون میں غامدی سینٹر کے ریسرچ اسکالر ڈاکٹر عرفان شہزاد نے پاکستان کے تعلیمی نظام پر تنقید کرتے ہوئے جبری تعلیم کے نقصانات اور بچوں کے مستقبل پر اس کے منفی اثرات کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ تعلیمی رجحان نہ رکھنے والے بچوں کو حصول تعلیم پر مجبور کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ ایسے بچوں کو زبردستی تعلیم دلا بھی دی جائے تو بہت محنت کے بعد بھی معمولی کارکردگی ہی دکھا پاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ معمولی تعلیم کی وجہ سے کوئی ڈھنگ کی ملازمت پانے میں بھی ناکام رہتے ہیں اور اپنے طبعی ٹیلنٹ کو برتنے کی مسرت اور اس کے ذریعے سے ممکنہ کامیابی سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ اپنا قیمتی وقت درست مصرف میں لگائیں تو رسمی تعلیم کے حصول کی ذہنی اذیت سے بھی بچیں گے اور پیشہ ورانہ زندگی میں بہت جلد مناسب مقام بھی حاصل کر پائیں گے۔ یہ مضمون ''اشراق امریکہ'' کے اکتوبر کے شمارے میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ہفتہ وار سوال وجواب کی نشست

غامدی سینٹر میں ہر ماہ ہفتہ وار سوال و جواب کی براہ راست نشست کا اہتمام ہوتا ہے جس میں مختلف موضوعات پر لوگوں کے سوالات اور اعتراضات کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اکتوبر میں میں سوال و جواب کی اس نشست میں ''سیدنا علی اور امیر معاویہ، یزید اور واقعہ کربلا'' کا موضوع زیر بحث لایا گیا۔ سوال وجواب کی ہفتہ وار ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

''میں کون ہوں؟''

یہ سوال غامدی سینٹر کے ہفتہ وار پروگرام ''سوال وجواب سید منظور کے ساتھ'' میں زیر بحث آیا ہے۔ انسان کی حقیقت کیا ہے، وہ کب پیدا ہوا، روح اور جسم کا کیا تعلق ہے، عہد الست کی کیا نوعیت ہے، یہ اور اس طرح کے مختلف سوالات پر اس پروگرام میں گفتگو ہوئی ہے۔ یہ اور اس

سلسلے کے دیگر اپی سوڈ ہمارے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ ہفتہ وار پروگرام ہے، جو ہر جمعہ کے روز پاکستانی وقت کے مطابق رات 9 بجے نشر ہوتا ہے۔

”سد ذریعہ کیا ہے؟“

ملایشیا میں 2018 میں حسن الیاس صاحب نے ”سد ذریعہ کیا ہے؟“ کے عنوان سے جاوید احمد غامدی صاحب کے ساتھ ایک نشست ریکارڈ کرائی تھی۔ اس نشست میں سد ذریعہ کی حقیقت، سد ذریعہ کی بنیاد کا قرآن و حدیث سے ثبوت، سد ذریعہ کے اصول پر فقہا کا بعض اعمال کو ممنوع ٹھہرانا اور سد ذریعہ سے متعلق دیگر اہم سوالات کو زیر بحث لایا گیا۔ گذشتہ ماہ یہ پروگرام غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر نشر کیا گیا۔

والدین، نوعمری اور ازدواجی زندگی کے مسائل

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ لوگوں سے نجی طور پر ملاقاتیں کرتے ہیں۔ ان ملاقاتوں میں لوگ اپنے مختلف ذاتی اور خاندانی نوعیت کے مسائل میں شہزاد سلیم صاحب سے مشاورت کرتے ہیں۔ گذشتہ ماہ ڈاکٹر شہزاد سلیم نے مختلف لوگوں کے ساتھ 18 پرائیویٹ سیشن کیے۔ ان ملاقاتوں میں لوگوں نے شہزاد سلیم صاحب سے والدین کو درپیش مشکلات اور نوعمری اور ازدواجی مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف ضرورتوں کے تحت 5 فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں محمد حسن الیاس نے جاری کیا۔

Ask Dr. Shehzad Saleem

یہ سوال و جواب کی لائیو ماہانہ نشست ہے، جس میں ڈاکٹر شہزاد سلیم لوگوں کے ذہنوں میں

اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔ اس کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

منظوم حدیث

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی منظوم ترجمانی کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ سید منظور الحسن فضائل اخلاق پر مبنی حدیثوں کو نظم کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ کام بچوں کی دینی تعلیم کے لیے ہے، لہٰذا اِن نظموں کا اسلوب عام فہم ہے۔ اکتوبر کے ''اشراق امریکہ'' میں مسند احمد کی ایک روایت کی منظوم ترجمانی شائع ہوئی ہے۔ اِس کا عنوان ہے: ''اللہ کا اپنے بندوں پر حق''۔ نظم کے دو شعر یہ ہیں:

فرمایا پیمبرؐ نے: ''سنو بات حقیقی
اللہ کا حق ہے کہ عبادت ہو اُسی کی
خالق ہے وہی سب کا، وہی سب کا الٰہ ہے
پوجا کا سزاوار فقط ایک خدا ہے

''شادی اور رشتے''

نوجوان نسل ہمارا مستقبل ہے۔ اُس کے ذہن میں اٹھنے والے دینی اور فکری سوالات کا جواب اہل علم کی ذمہ داری ہے۔ اِسی مقصد کے پیش نظر غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ وقتاً فوقتاً اہل علم و دانش کو مدعو کر کے اُن کے ساتھ نوجوانوں کے مکالموں کا اہتمام کرتا ہے۔ اِس ضمن میں ''شادی اور رشتے'' کے موضوع پر محمد بشار الیاس کی میزبانی میں یوسف غنی صاحب کے ساتھ پروگرام ریکارڈ کیے گئے۔ اس میں یوسف غنی صاحب نے شادی کا مقصد اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف چیزوں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ شادی سے پہلے مرد و عورت کا ایک دوسرے کی فطرت کو جاننا بہت ضروری ہے۔ اکتوبر 2023 میں اس موضوع پر دو پروگرام نشر کیے گئے، جو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

دنیانیوز کے لیے ہفتہ وار پروگراموں کی ریکارڈنگ

"علم و حکمت: غامدی کے ساتھ" دنیانیوز چینل پاکستان کا ایک معروف پروگرام ہے، جو کئی برس سے نشر ہو رہا ہے۔ یہ ڈیلس میں ریکارڈ ہوتا ہے اور ہفتہ وار نشر ہوتا ہے۔ میزبانی کے فرائض حسن الیاس صاحب انجام دیتے ہیں۔ اکتوبر 23 میں 4 پروگرام ریکارڈ کیے گئے اور دنیانیوز سے نشر ہوئے۔ ان پروگراموں کے موضوعات یہ ہیں: "انسانی نفسیات کی بہتری کے اصول"، "قومی ریاست میں حکومت کی نوعیت" اور "سوال و جواب"۔

قرآن، حدیث اور بائیبل کی تدریس

شہزاد سلیم صاحب نے انگریزی زبان میں "اسلام اسٹڈی سرکل" کے عنوان سے ایک سیشن کا آغاز کیا ہے۔ اس میں وہ مختلف دینی، اخلاقی اور سماجی موضوعات پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کرتے ہیں۔ یہ سیشن تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں قرآن مجید کی آیات سے ایک موضوع منتخب کر کے اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ دوسرے حصے میں منتخب احادیث نبوی پر گفتگو ہوتی ہے۔ تیسرے حصے میں بائیبل کے کسی اقتباس کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ پروگرام کے آخر میں موضوع سے متعلق سوالوں کے جواب بھی دیے جاتے ہیں۔ پچھلے مہینے کے سیشن میں "قانون کی حکمرانی"، "غصے پر قابو پانا"، "سب سے بڑا خدائی حکم" اور "مخلوط تعلیم" جیسے موضوعات زیر بحث رہے۔